ماہنامہ

پیغامِ صلح

مدیر: ناصر احمد بی۔ اے، ایل ایل بی

جلد ۸۴ جنوری، فروری ۲۰۰۰ء شمارہ ۔۔ ۱، ۲

اس شمارے میں

☆ ۲۱ویں صدی عیسوی کے لئے اسلام کا پیغام ۔۔ ۱
___ وزیر اعظم بوسنیا

☆ نیا نظام عالم: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ۔۔ ۵ ۔۔ ۳
___ حضرت مولانا محمد علی

☆ اسلام کا تعارف ۔۔ ۳ ___ ڈاکٹر زاہد عزیز، انگلستان ۔۔ ۸

☆ خطبہ عید الفطر: روحانی مدارج حاصل کرنے میں ارکان اسلام کی اہمیت ۔۔ ۱۱
___ ناصر احمد

☆ دعا کی حقیقت اور تاثیر ___ ماخوذ از بلیٹن احمدیہ انجمن، برلن ۔۔ ۱۵

☆ اخبار کا تراشہ: اکیسویں صدی کا جہاد قرآن حکیم کے ذریعہ ۔۔ ۱۷
___ مولانا محمد شہاب الدین ندوی

☆ کتاب کا تعارف: قرآن سے قرآن تک ۔۔ ۲۰
___ مصنفہ علامہ محمد حسین عرشی

ناشر: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہور) یو ایس اے

پتہ: ۱۳۱۵ کنگز گیٹ روڈ، کولمبس، اوہائیو ۱۵۰۴-۴۳۲۲۱ (یو ایس اے)

www.aaiil.org

بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام نے تحریک میں شمولیت کے لئے ذیل کے شرائط مقرر کئے:

دس شرائط بیعت

۱ بیعت کنندہ سچے دل سے عہد اس بات کا کرے کہ آئندہ اس وقت تک کہ قبر میں داخل ہو جائے شرک سے مجتنب رہے گا۔

۲ یہ کہ جھوٹ اور زنا اور بدنظری اور ہر ایک فسق اور فجور اور ظلم اور خیانت اور فساد اور بغاوت کے طریقوں سے بچتا رہے گا اور نفسانی جوشوں کے وقت ان کا مغلوب نہیں ہو گا اگرچہ کیسا ہی جذبہ پیش آوے۔

۳ یہ کہ بلاناغہ پنجوقتہ نماز موافق حکم خدا اور رسولؐ کے ادا کرتا رہے گا اور حتی الوسع نماز تہجد کے پڑھنے اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے اور ہر روز اپنے گناہوں کی معافی مانگنے اور استغفار کرنے میں مداومت اختیار کرے گا اور دلی محبت سے اللہ تعالیٰ کے احسانوں کو یاد کر کے اس کی حمد اور تعریف کو ہر روز اپنا ورد بنائے گا۔

۴ یہ کہ عام خلق اللہ کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اپنے نفسانی جوشوں سے کسی نوع کی ناجائز تکلیف نہیں دے گا۔ نہ زبان سے نہ ہاتھ سے نہ کسی اور طرح سے۔

۵ یہ کہ ہر حال رنج اور راحت اور عسر اور یسر اور نعمت اور بلا میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کرے گا اور بہر حالت راضی بقضا ہو گا اور ہر ایک ذلت اور دکھ کے قبول کرنے کے لئے اس کی راہ میں تیار رہے گا اور کسی مصیبت کے وارد ہونے پر اس سے منہ نہیں پھیرے گا بلکہ آگے قدم بڑھائے گا۔

۶ یہ کہ اتباع رسم اور متابعت ہوا و ہوس سے باز آئے گا اور قرآن شریف کی حکومت کو بکلی اپنے سر پر قبول کرے گا اور قال اللہ اور قال الرسول کو اپنی ہر راہ میں دستور العمل قرار دے گا۔

۷ یہ کہ تکبر اور نخوت کو بکلی چھوڑ دے گا اور فروتنی اور عاجزی اور خوش خلقی اور حلیمی اور مسکینی سے زندگی بسر کرے گا۔

۸ یہ کہ دین اور دین کی عزت اور ہمدردی اسلام کو اپنی جان اور اپنے مال اور اپنی عزت اور اپنی اولاد اور اپنے ہر ایک عزیز سے زیادہ عزیز تر سمجھے گا۔

۹ یہ کہ عام خلق اللہ کی ہمدردی میں محض للہ مشغول رہے گا اور جہاں تک بس چل سکتا ہے اپنی خدا داد طاقتوں اور نعمتوں سے بنی نوع کو فائدہ پہنچائے گا۔

۱۰ یہ کہ اس عاجز سے عقد اخوت محض للہ باقرار طاعت در معروف باندھ کر اس پر تا وقت مرگ قائم رہے گا اور اس عقد اخوت میں ایسا اعلیٰ درجہ کا ہو گا کہ اس کی نظیر دنیوی رشتوں اور تعلقوں اور تمام خادمانہ حالتوں میں پائی نہ جاتی ہو۔

("ازالہ اوہام" از حضرت مرزا غلام احمد قادیانی، بانی سلسلہ احمدیہ صفحات ۸۵۳، ۸۵۴-۱۸۹۱ء)

فلسطین، کشمیر، بوسنیا اور چیچنیا میں مسلمانوں کی حالت زار

۲۱ویں صدی عیسوی کے لئے اسلام کا پیغام

وزیر اعظم بوسنیا کی تقریر کا متن جو انہوں نے گذشتہ سال پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر اسلامی سربراہی کونسل کے خصوصی اجلاس میں کی

☆ہمیں نہیں معلوم کہ ۲۱ویں صدی کیسی ہوگی۔ لیکن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ گذشتہ صدی کس طرح گزری۔ مختصراً یہ کہ لوگوں نے اپنے ہی ہم وطن دس لاکھ ۷۰ ہزار لوگوں کو ہلاک کیا۔ ☆ہم جانتے ہیں کہ انسانی رویوں میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ تو ہم اس آنے والی نئی صدی سے کیا توقعات رکھ سکتے ہیں؟ شاید مزید ۱۰ کھرب انسانوں کی ہلاکت! ☆اسلام اور مسلمان ترقی یافتہ دنیا کی دوسری طرف ہیں جنہوں نے قدرتی وسائل کا نہ غلط استعمال کیا اور نہ ہی اس کے ذریعہ لوگوں کا استحصال کیا۔ اس لئے اسلام اور مسلمان ۲۱ویں صدی میں ایک طرح سے یوں داخل ہوں گے کہ ان کا کردار بے داغ ہو گا۔ ☆اگر ہم امن کی بات کرتے ہیں تو اس کا پیغام تو اسلام کے نام میں ہی پنہاں ہے۔ ان مضبوط اصولوں کو لے کر اسلام اور مسلمان ۲۱ویں صدی میں داخل ہو سکتے ہیں اور ایک بہتر بلکہ نئی دنیا کی تعمیر کے لئے موثر کردار ادا کرسکتے ہیں۔ ☆ایک اور اہم بات جس کی بہت ضرورت ہے اور جس کی ۲۱ویں صدی میں بے حد ضرورت ہوگی وہ ہے تحمل اور رواداری۔ ☆اسلام کی تاریخ بنیادی طور پر تحمل اور رواداری کی تاریخ ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے ملک بوسنیا ہرزگووینا کا ذکر کروں گا۔ سخت مشکل حالات کے باوجود ہم نے بوسنیا ہرزگووینا میں انسانیت کو زیادہ سے زیادہ فاتح رکھنے کی کوشش کی۔ مساجد کو برباد کیا گیا لیکن جہاں کہیں ہمارا قبضہ تھا عیسائی گرجے اور یہودیوں کے معبد خانے بالکل محفوظ رہے۔ یہ خون اور انتقام کے مقابلہ میں ایمان اور رواداری کی فتح کے خاموش یادگاری ستون ہیں۔ اور یہ ہے بوسنیا ہرزگووینا۔ موجودہ اسلام کی تاریخ میں یہ ایک واحد اور شاندار مثال ہے جو مسلمانوں کو ۲۱ویں صدی میں لے جانے کے قابل بناتی ہے۔ ☆لیکن ایک بات جس کا ہونا مسلمانوں کے لئے بے حد ضروری ہے اور جس کا ہم سب کو بخوبی علم بھی ہے......وہ ہے تعلیم۔ ☆یہ ایک انتہائی افسوسناک اور تاریخی لحاظ سے گمراہ کن راستہ ہوگا اگر غزالی، ابن سینا، ابن رشد، ابن خلدون، عمر خیام اور اقبال کی روحانی بیٹیاں علم سے بے بہرہ رہ جائیں جیسا کہ ہم میں سے بعض کا خیال ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس سلسلہ میں قرآن مجید کا یہ بڑا واضح پیغام ہے۔

بھائیو اور دوستو!

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

جناب صدر مجھے اجازت دیں کہ میں بوسنیا ہرزگووینا کے صدر محترم علیجاہ عزت بیگووچ کی طرف سے مبارکبادی کے پیغام اور اسلام علیکم آپ لوگوں تک پہنچاؤں۔ ان کی بے حد خواہش تھی کہ وہ آج کے اس خصوصی اجلاس میں شرکت کرتے لیکن ان کی دیگر اہم فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے انہیں کسی اور جگہ جانا ضروری ہوگیا تھا۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ان تمام ممالک کے حضرات کا ممنون احسان ہوں جو مسلسل بوسنیا ہرزگووینا کے لوگوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ آج کے دن محترم صدر مجلس اور اس مبارک موقع پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور یاد دلاتا ہوں کہ ۱۹۹۲ء میں بطور وزیر اعظم آپ نے بوسنیا کی مدد کا آغاز کیا تھا اور پھر بعد کی حکومتوں نے اس کو جاری رکھا۔ بوسنیا ہرزگووینا کے لوگ اس کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ ہم آج ۲۱ویں صدی کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ۲۱ویں صدی کیسی ہوگی۔ لیکن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ گذشتہ صدی کس طرح گزری۔ مختصراً یہ کہ لوگوں نے اپنے ہی ہم وطن دس لاکھ ۷۰ ہزار لوگوں کو ہلاک کیا۔ اندازہ لگائیں کہ دس لاکھ ۷۰ ہزار لوگوں کو گذشتہ صدی میں ہلاک کیا گیا! یہ ہلاکت صرف اتنی ہی ہوئی کیونکہ ابھی یہاں ٹیکنالوجی اتنی ترقی یافتہ نہ تھی۔ اس لئے ہلاک کرنے کی صلاحیت یا ہمارے اخلاقیات کا دائرہ عمل بدقسمتی سے ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے محدود رہا اور معاملہ اس کے الٹ ہوا۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی رویوں میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ تو ہم اس آنے والی نئی صدی سے کیا توقعات رکھ سکتے ہیں؟ شاید مزید ۱۰ کھرب انسانوں کی ہلاکت! اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں اسلام کیا کردار ادا کرسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند باتیں اور

تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے میں یہ کہوں گا کہ پہلی عالمی جنگ میں اسلام اور مسلمانوں کے علاوہ دیگر معصوم قوموں کا کچھ بھی اس میں حصہ نہ تھا اور اسی طرح دوسری عالمی جنگ میں بھی ہمارا کوئی کردار نہ تھا جن کے دوران ۲ کروڑ لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ اسلام کا فاشزم (فسطائیت) اور اشتراکیت سے بھی کوئی تعلق نہیں جس کی جھوٹی اجتماعیت اور جور و ستم کے دیگر طور طریقوں نے مزید ۸ کروڑ لوگوں کو ہلاکت میں دھکیلا۔ مزید یہ کہ اسلام اور مسلمان ترقی یافتہ دنیا کی دوسری طرف ہیں جنھوں نے قدرتی وسائل کا نہ غلط استعمال کیا اور نہ ہی اس کے ذریعہ لوگوں کا استحصال کیا۔ اس لئے اسلام اور مسلمان ۲۱ویں صدی میں ایک طرح سے یوں داخل ہوں گے کہ ان کا کردار بے داغ ہو گا۔ اسی طرح کئی اور باتوں کا بھی اس ضمن میں ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم جمہوریت کی بات کرتے ہیں کہ اس میں اختلاف رائے کا احترام کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس قرآن مجید کا شوریٰ کا تصور ہے۔ اگر ہم باہم گفت و شنید کی ضرورت کی بات کرتے ہیں اور یہ کہ اس طریق پر ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طریق پر سمجھا جا سکتا ہے تو اس بارے میں قرآن مجید کا شاندار پیغام یہ ہے:

"اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو" (الحجرات ۴۹:۱۳)۔

اگر لوگوں کے باہم تعلقات، طرز زندگی اور ماحول کے اثرات کی بات کی جاتی ہے تو ہمیں پھر قرآن مجید کی طرف (رہنمائی کے لئے) دیکھنا ہو گا جہاں وہ اس کرہ ارض کو انسانوں کے لئے غیر محفوظ بنانے کے خلاف سخت تنبیہ کرتا ہے۔ اگر ہم انسانوں کی طرح جانوروں (کی دیکھ بھال یا ان کی حفاظت) کی بات کرتے ہیں تو اس بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ملاحظہ فرمائیں۔

"اور زمین میں کوئی جاندار نہیں اور نہ کوئی پرند جو اپنے دو پروں پر اڑتا ہے مگر وہ بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔ پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کئے جائیں گے" (الانعام ۶:۳۸)۔

اگر ہم امن کی بات کرتے ہیں تو اس کا پیغام تو اسلام کے نام میں ہی پنہاں ہے۔ ان مضبوط اصولوں کو لے کر اسلام اور مسلمان ۲۱ویں صدی میں داخل ہو سکتے ہیں اور ایک بہتر بلکہ نئی دنیا کی تعمیر کے لئے موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ایک اور اہم بات جس کی بہت ضرورت ہے اور جس کی ۲۱ویں صدی میں بے حد ضرورت ہو گی وہ ہے تحمل اور رواداری۔ اس دور میں جبکہ آمدورفت کے انتہائی ترقی یافتہ ذرائع نے مختلف تہذیب و تمدن کے لوگوں کو ایک دوسرے کے بالکل قریب کر دیا ہے بلکہ وہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر مختلف خیالات کے لوگ جو ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں اور ایک دوسرے کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتے انہیں ایک دوسرے سے زیادہ ملنا چاہئے اور ایک دوسرے سے مل کر کام کرنا چاہئے۔ اس ملاپ اور رابطہ میں تحمل اور رواداری کا ہونا بے حد ضروری ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہ سکیں اور ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں۔ اسلام اس بارے میں بہت اچھی مثال رکھتا ہے صرف الفاظ میں نہیں بلکہ عملی رنگ میں۔ اسلام کی تاریخ بنیادی طور پر تحمل اور رواداری کی تاریخ ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے ملک بوسنیا ہرزگووینا کا ذکر کروں گا۔ سخت مشکل حالات کے باوجود ہم نے بوسنیا ہرزگووینا میں انسانیت کو زیادہ سے زیادہ فاتح رکھنے کی کوشش کی۔ مساجد کو برباد کیا گیا لیکن جہاں کہیں ہمارا قبضہ تھا عیسائی گرجے اور یہودیوں کے معبد خانے بالکل محفوظ رہے۔ یہ خون اور انتقام کے مقابلہ میں ایمان اور رواداری کی فتح کے خاموش یادگاری ستون ہیں۔ اور یہ ہے بوسنیا ہرزگووینا۔ موجودہ اسلام کی تاریخ میں یہ ایک واحد اور شاندار مثال ہے جو مسلمانوں کو ۲۱ویں صدی میں لے جانے کے قابل بناتی ہے۔ اس نئی صدی میں رواداری کی بے حد ضرورت ہو گی اور یہ واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ آنے والی صدی وہ دور ہے جس میں انسانیت اور جدید اثرات کے حامل ایسے نظریہ حیات کی ضرورت ہو گی جو انسانی تکریم، رواداری، صبر و تحمل اور متوازن فکر اور طرز زندگی کا علمبردار ہو۔

لیکن ایک بات جس کا ہونا مسلمانوں کے لئے بے حد ضروری ہے اور جس کا ہم سب کو بخوبی علم بھی ہے........وہ ہے تعلیم۔ ہمیں تعلیم کی بے حد ضرورت ہے۔ مسلمان لڑکیوں کو تعلیم کے لئے درسگاہوں میں ضرور جانا چاہئے۔ یہ ایک انتہائی افسوسناک اور تاریخی لحاظ سے گمراہ کن راستہ ہو گا اگر غزالی، ابن سینا، ابن رشد، ابن خلدون، عمر خیام اور اقبال کی روحانی بیٹیاں علم سے بے بہرہ رہ جائیں جیسا کہ ہم میں سے بعض کا خیال ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس سلسلہ میں قرآن مجید کا یہ بڑا واضح پیغام ہے۔

"اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔ انسان کو ایک لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب سب سے بڑھ کر بزرگی والا ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا" (العلق ۹۶:۱تا۵)۔

صدق اللہ العظیم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انگریزی سے ترجمہ: ممتاز احمد باجوہ-ایم اے، ایم ایڈ

نیا نظام عالم: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ــــ ۵

حضرت مولانا محمد علی صاحب مفکر اسلام و مفسر قرآن کی معروف انگریزی کتاب "نیو ورلڈ آرڈر" کا ترجمہ

حضرت مولانا محمد علی صاحب نے دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر ۱۹۴۴ء میں "نیو ورلڈ آرڈر" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کے اردو ترجمہ کی یہ آخری قسط ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے ریاست کا کیا کردار ہونا چاہئے۔ اور کس طرح قوموں میں باہم خوشگوار تعلقات پروان چڑھ سکتے ہیں اور مغرب کی ترقی یافتہ اقوام اُس وقت نئے نظام عالم کے نام پر در پردہ کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ ان تمام پہلوؤں پر حضرت مولانا نے سیر حاصل بحث کی اور ان خدشات کا بھی اظہار کیا جو نام نہاد مغربی اقوام جمہوریت اور آزادی کے نام پر "نیا نظام عالم" کا نعرہ لگا کر در پردہ مسلمانوں کا استحصال کرنے کے پروگرام بنا رہی تھی۔ آج دنیا ایٹمی جنگ کے دھانے پر کھڑی ہے اور مغربی اقوام مسلمانوں اور مسلمان حکومتوں کے استحصال کے جو منصوبے بنا رہی تھیں وہ اب کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ اب پھر ایک اور نئے نظام عالم کا نعرہ ہے۔ مسلمانوں کا بے دریغ خون فلسطین، بوسنیا، چیچنیا، افغانستان اور کشمیر میں بہہ رہا ہے اور جمہوریت اور انسانی حقوق کے یہ ٹھیکیدار خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ مسلمان اسلامی تعلیمات کی روح اور روایات کو کاروبار حکومت اور کاروبار زندگی میں اپنانے کی طرف متوجہ ہوں۔ ورنہ ہمارے بلند بانگ دعووں کے باوجود معصوم مسلمانوں کا خون بہتا رہے گا۔ وزیر اعظم بوسنیا کی گذشتہ سال کی تقریر جو ہم نے اس شمارے کے شروع میں شائع کی ہے پکار پکار کر ہمارے ضمیر کو جگانے کی ایک دردمند کوشش ہے۔ اللہ کرے ہم تفرقہ بازی اور دنیاوی مفادات سے بلند تر ہو کر قومی سوچ کو اپنائیں اور دشمنوں کے خلاف اتحاد اور غیرت کا مظاہرہ کریں۔ ایڈیٹر

باب چہارم: ریاست

شروع میں ریاست کا مقصد انسان کی آزادی اور اس کے لئے انصاف کے حصول کو یقینی بنانا اور زیادہ طاقتور ہمسایوں کے ظلم و ستم سے حفاظت تھا۔ لیکن مادی تہذیب کی ترقی کے ساتھ اس کا رجحان انسان کو زیادہ سے زیادہ آزادی سے محروم کرنا، اس کو غلام بنانا اور اس کے خلاف ہونے والے ظلم و ستم کو روکنے کی بجائے یہ خود ظلم و ستم کا آلہ بن گئی ہے۔ وسیع تر تناظر میں اگر بات کی جائے تو مادی تہذیب نے تین قسم کی ریاستوں کو جنم دیا ہے۔ جمہوری ریاست، فسطائی ریاست اور بالشویک ریاست۔ ان میں سے فسطائی ریاست واضح طور پر ہی سب کچھ ہوتی ہے جس میں افراد حکومت کے غلام ہوتے ہیں اور اس کی مرضی پر عمل درآمد کرنے کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔ فسطائیت کے علمبرداروں کا اس بارے میں مؤقف بڑا واضح ہے اگرچہ اصولی طور پر غلط ہے کیونکہ انفرادی شخصیت کی آزادی اور عظمت کے فلسفہ سے ان کے نزدیک سوائے بربادی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یا یہ کہ انسان کُل کے اندر رہتے ہوئے اور اس کے ذریعہ ہی آزاد رہ سکتا ہے۔ اور وہ کُل ریاست ہی ہو سکتی ہے جو کسی پابندی یا بحث و تمحیص کو برداشت نہیں کر سکتی۔ بالشوک حکومت جو در حقیقت سرمایہ دار حکومت ہے وہ فسطائی ریاست سے ایک قدم آگے جاتی ہے۔ یعنی وہ فسطائی یا مکمل آمریت کے نظریئے کی انتہائی عملی صورت ہے اور فرد کی آزادی اور ملکیت دونوں کو ختم کر دیتی ہے۔

جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے اصولی حد تک ان کے دعاوی بہت بلند بانگ ہیں۔ لیکن عملی طور پر وہ اپنی دو چھوٹی بہنوں سے بھی دو قدم آگے ہے۔ اور اس نے آدھی سے زیادہ نسل انسانی کو مختلف ناموں سے غلام بنا رکھا ہے، جن کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ کمزور ہیں۔

ریاست کے یہ تمام نئے تصورات یا صورتیں مغرب کی مادی تہذیب کی ترقی کے پیداوار ہیں۔ مادی فوائد مہذب دنیا کے خیالات پر اتنا مسلط ہو چکے ہیں کہ خدا اور مذہب کو انتہائی پس پشت حالت میں کر دیا گیا ہے نہ صرف بالشوک روس میں جہاں لامذہبیت ریاست کا مذہب ہے اور جرمنی میں جہاں ہٹلر کو ایک قسم کا خدا سمجھ لیا گیا ہے بلکہ ان ملکوں میں بھی جو بظاہر ابھی تک حضرت عیسیٰؑ اور عیسائیت سے اپنی وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک خدا کے اقتدار اعلیٰ ہونے کا تعلق ہے ہو سکتا ہے کہ تمام مغربی ریاستیں سطحی طور پر ایک دوسرے سے اتفاق نہ کریں لیکن حیرانگی کی بات یہ ہے کہ وہ ان دونئے

خداؤں کی پرستش کرنے میں ضرور متحد نظر آتی ہیں۔ جن کو مادی تہذیب نے خدائے واحد کی جگہ تخلیق کیا ہے اور جہاں خدائے واحد کو ماضی کا ایک قصہ قرار دے کر وہ چھوڑ چکی ہیں اور جہاں قوم اور ریاست دو نئے بت ہیں جن کے سامنے مہذب آدمی سر بسجود ہو گیا ہے۔ اور ایک بہت ہی پرانے بت، جو قدیم سے زندہ ہے یعنی دولت کا دیوتا یعنی مادیت، اس کی ایک اپنی تثلیث ہے جس نے چرچ کی تثلیث کی جگہ لے رکھی ہے۔ مہذب انسان کا اب صرف اور صرف مطمع نظر اور مقصود معاشی فوائد اور دولت کا حصول ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ریاست یا قوم کے نام پر وہ ہر قسم کی قربانی جو اس سے طلب کی جا سکتی ہے دینے کو تیار ہے۔ اس طرح دولت، قوم اور ریاست مہذب انسان کے دل میں عزت کا اعلیٰ مقام حاصل کر چکی ہیں۔ اور وہ ان بتوں کی ایک طرح سے پوجا کرتا ہے۔ انسان کی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ کسی کے آگے جھکے۔ اگر وہ اپنے خالق کے آگے نہیں جھکے گا تو وہ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزوں کے سامنے ضرور جھکے گا۔ پرستش یعنی ناقابل چیز کے سامنے جھکنا انسانیت کی تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ اور اب دولت کی دیوی اور اس کے دو ساتھی قوم اور ریاست کی پرستش جن کے ذریعہ مادیت کی تثلیث کے بڑے بت تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے اس تہذیب کو بھی اب تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔

ریاست کی ضرورت تو اس لئے تھی کہ وہ انسان کی انسان کے خلاف جارحیت کو روکے، کمزور کی طاقتور کے خلاف مدد کرے اور انسان اور انسان کے درمیان انصاف کو یقینی بنائے۔ لیکن ہم مہذب ریاست کو کس حالت میں دیکھتے ہیں۔ مغرب میں ریاست خواہ وہ جمہوریت کا لیبل لگائے ہوئے ہے یا فسطائیت یا بالشویک ریاست کی شکل میں ہو۔ یہ تمام توسیع پسند عزائم لئے ہوئے ہیں۔ جارحیت کا ارتکاب کرتے ہیں اور کمزور کا استحصال کرتے ہیں جو خود اپنی حفاظت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ صرف میکیاولی کا ہی نظریہ نہیں ہے جس کے نزدیک انصاف یا ناانصافی کوئی وقعت نہیں رکھتی جب ریاست کی حفاظت خطرے میں ہو۔ وہ لوگ بھی جو بظاہر اس کی مخالفت کرتے ہیں اسی کے نقش قدم پر چلتے ہیں بلکہ وہ ایک قدم اور آگے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک ریاست کی توسیع اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اس کا دفاع۔ دنیا میں سونے کا مالک ہونے اور بموں اور بم پھینکنے والے جہازوں کی طاقت کی اہلیت رکھنے والے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کو زیادہ حق ہے کہ وہ اپنی قوم کیلئے زیادہ سے زیادہ معاشی فوائد حاصل کر سکیں۔ دوسری قوم کے ملک میں داخل ہونا ان کا فرض بن جاتا ہے جب کہ دوسری قوم اتنی کمزور ہو کہ اپنا دفاع نہ کر سکے۔ اس پر اتنی تیزی سے حملہ کرنا چاہئے کہ ان کو اپنے دفاعی اقدامات لینے کا موقع ہی میسر نہ ہو سکے اور اس کو ایک اچھی کارکردگی شمار کیا جاتا ہے۔

جارحیت کو مہذب دنیا کی روح سمجھا جاتا ہے کمزور کے کوئی حقوق نہیں ہوتے۔ حقوق صرف اس کے ہوتے ہیں جن کے پاس طاقت ہے اور اس طاقت کے بل پر عزت اور دبدبہ حاصل کرتے ہیں۔ اور اگر کمزور ہمسایہ طاقتور حکومت کے حکم کی طرف توجہ نہ کرے تو اس کا نام صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ تمام مغربی اقوام کی یہی ذہنیت ہے اس لئے ہر ریاست دوسری ریاست سے اپنی فوجوں اور اسلحہ کی دوڑ میں آگے بڑھنا چاہتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف ریاستوں میں شدید قسم کے جھگڑے ہیں اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اس قسم کی صورتحال کی ذمہ داری ریاست کے مادی تصور کی وجہ سے ہے۔ ہر ریاست کے پاس یہ طاقت ضرور ہونی چاہئے جس کے ذریعہ وہ کمزور کے خلاف جارحیت اور استحصال کو روک سکے، کمزور کی حفاظت کر سکے اور ہر ایک سے برابری کی سطح پر انصاف کر سکے۔

سائنس کی ترقی نے اس طاقت کو ہزاروں گنا بڑھا دیا ہے۔ دوسری طرف زندگی کے متعلق مادی نقطہ نگاہ نے انسان کو اپنے جیسے انسان کے خلاف طاقت استعمال کرنے کے معاملہ میں زیادہ غیر محتاط بنا دیا ہے۔ کائنات کی تسخیر کے ساتھ اپنے نفس پر قابو پانے کا کام پس پشت اور نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ جو انسان کا انسان کے خلاف ظلم پر روک لگانے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کے اختیارات میں اضافہ جو افراد کے ذریعہ ہی استعمال ہوتے ہیں وہ انسانوں کو زیادہ غلام بنانے اور اس کا استحصال کرنے میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ بجائے اس کی کے وہ ان کو ظلم و زیادتی سے روکنے اور سچائی اور انصاف کی سربلندی کے لئے استعمال ہوتے۔ یہ بات صحیح ہے کہ سائنس نے انسان کو دیوتاؤں کی طاقت استعمال کرنے کے قابل بنا دیا ہے لیکن مہذب آدمی نے درندگی کا رجحان اختیار کر لیا ہے۔ ریاست جو ابتدائی طور پر اس لئے وجود میں آئی تھی کہ وہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ خوشیاں فراہم کر سکے۔ خود انسانی خوشیوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن گئی ہے۔ فرد اس بت سے اتنا متاثر ہو چکا ہے کہ وہ چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے بھی اس مشینری کا حصہ بن کر رہ گیا ہے جو اس کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔

اس برائی کے علاج کے لئے اسلام ریاست کے اختیار ان لوگوں کے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے جو سب سے زیادہ خدا خوف ہوں۔ اسلامی حکومت کے سربراہ کو امیر (یعنی جو حکم دے یا حکومت کرے) اور امام کہا گیا ہے۔ جس کی مثال قابل تقلید ہو یعنی ایسا شخص جو اخلاق کے بلند مقام پر کھڑا ہو۔ حضرت ابو بکرؓ کو جو سب سے بہترین انسان تھے ان کو اپنی غیر حاضری میں مسلمانوں کا پیش امام مقرر کر کے حضرت نبی کریمؐ نے اپنے بستر مرگ پر ایک اشارہ دیا کہ مسلم حکومت کا سربراہ کی حیثیت سے کون ان کی جانشینی کرے گا۔ بہت عرصہ تک یہ عمل جاری رہا اور سربراہ مملکت نمازوں میں پیش امام رہا۔ سچائی، خدا خوفی اور دوسرے لوگوں کے حقوق کے خیال یہ وہ خصوصیات تھی جو ایک حاکم میں ہونا ضروری تھیں۔ صرف روحانی طاقت ہی انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو جو مادی (دنیاوی) عہدہ اس کو دیتا ہے صحیح طور پر استعمال کر سکے۔ ایسی طاقت کی عدم موجودگی میں اکثر ان

اختیارات کے غلط استعمال کا خطرہ رہتا ہے۔ اور ابتدائی اسلامی حکومت کے نظم ونسق اور قومی امور میں مادی اور روحانی دونوں عہدے ایک ہی سربراہ میں یکجا ہوتے تھے اور ریاست کی تاریخ میں یہ بہترین صورت میں چلتی رہی۔ سربراہ حکومت اپنے آپ کو اپنے مادی اختیارات کے استعمال میں سب سے پہلے خدا کے سامنے جوابدہ سمجھتا تھا۔ اور اپنے منتخب کرنے والوں کے سامنے اس کی ذمہ داری ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔

بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اسلامی مملکت ایک مذہبی حکومت تھی۔ مسلم حکومت کے سربراہ نے کبھی بھی اپنے آپ کو زمین پر خدا کا نمائندہ نہیں سمجھا بلکہ صرف عوام کا نمائندہ جو ان کی خدمت کرنے کے لئے چنا گیا ہے لیکن یقیناً وہ اپنے آپ کو ہر ایک امر میں اپنے اختیارات کے استعمال میں خدا کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ سمجھتا تھا۔ شاید تاریخ حضرت عمرؓ سے بڑھ کر کوئی فاتح نہ دکھلا سکے جو حضرت نبی کریمؐ کے دوسرے جانشین تھے جو عظیم فاتح ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم منتظم بھی تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک معمولی ترین شہری کو عوام کے سامنے انہیں ملامت کرنے سے نہ روکتے تھے جس نے بار بار کہا۔ "اے عمر خدا سے ڈرو"۔ اور جب کچھ لوگوں نے اس کو منع کرنے کی کوشش کی تو خود حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر مداخلت کی اور کہا کہ اس کو کہنے دو۔ ان لوگوں کا کیا فائدہ ہے اگر یہ مجھے ایسی باتیں نہ بتائیں"۔ چار مملکتوں کا حکمران رات کو ایک قحط زدہ کیمپ میں بھیس بدل کا معائنہ کرتے جاتا ہے اور جب اس نے ایک عورت کے پاس اپنے بچوں کو دینے کے لئے خوراک نہ پائی تو فوراً مدینہ گئے جو تین میل کے فاصلے پر تھا اور اپنے کندھے پر آٹے کی بوری لیکر واپس آئے تاکہ محروم عورت اور اس کے بچوں کو خوراک دے سکیں۔ جب ایک نوکر نے بوجھ اٹھا کر لے جانے کی پیشکش کی تو انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔ "اس دنیا میں تم میرا بوجھ میرے لئے اٹھا سکتے ہو لیکن قیامت کے دن کون میرا بوجھ اٹھائے گا۔ اور جب عوام کا یہ عظیم خادم بستر مرگ پر تھا ایک نوجوان نے آپ کی تعریف کی تو آپ نے فرمایا۔ "اے جوان ساتھی بس کرو۔ بس کرو۔ اگر میں نے اختیارات کے استعمال میں کوئی برائی کی ہو گی تو ایسی نیکیوں سے ان کا ازالہ ہو جائے گا"۔ ایسا ذہنی رویہ ہی کسی شخص کو اپنے جیسے لوگوں پر حکومت کرنے کا صحیح اہل بناتا ہے۔ لیکن ایسا ذہنی رویہ خدا تعالیٰ پر مضبوط ایمان اور خدا کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

اسلام نے ایسی ذمہ دار حکومت ہی تشکیل دی تھی۔ ایسے لوگوں کی حکومت جن کو سب سے زیادہ یہ احساس ہو کہ وہ اپنے ہر ایک کام کے لئے جو وہ کریں خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ پھر لوگوں کی تکریم کی جائے۔ خاص طور پر وہ لوگ جن کو کوئی فریضہ سونپا جائے اور وہ اس کو پوری ذمہ داری سے سرانجام دیں (۱۳:۴۹)۔ ایسے ہی لوگوں کو دوسروں پر حاکم مقرر کرنا چاہئے۔ "اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو دو" (۵۸:۴) ہر کوئی جسے حکومتی انتظام میں کوئی اختیار دیا جاتا تو اس کو بتایا جاتا تھا کہ وہ اپنے حلقہ اختیار میں حکمران ہے۔ اور جو اس کے ماتحت ہیں ان کے متعلق وہ خدا کے ہاں جوابدہ ہو گا۔ "تم میں سے ہر کوئی حکمران ہے اور ہر کسی کو اپنے ماتحتوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ بادشاہ حکمران ہے اس کو اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ آدمی اپنے خاندان پر حکمران ہے اس کو ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔ جو اس کی حفاظت و کفالت میں ہیں۔ بیوی اپنے خاوند کے گھر میں حکمران ہے اس کو ان کے متعلق پوچھا جائے گا جو اس کے زیر نگرانی ہیں۔ اور ملازم حکمران ہے اپنے مالک کی جائیداد پر اس حد تک جو اس کے حوالے کی گئی ہے اور اس کے متعلق اس کو پوچھا جائے گا جو اس کے سپرد کیا گیا"۔ (بخاری ۱۱:۱۱) اسی طرح سے سربراہ حکومت کے ساتھ تمام وہ لوگ جن کو دوسروں پر کچھ اختیار دیا گیا ہے ان کی حیثیت ایک خادم کی سی ہے۔ جس طرح ایک ملازم کے حوالے کچھ جائیداد کی جائے تو اس کے لئے وہ اپنے مالک کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے اسی طرح وہ لوگ بھی جن کو حکومت میں کوئی عہدہ دیا جائے جن کے ذمہ لوگوں کی دیکھ بھال اور ان کے حقوق کی حفاظت سپرد ہو سب سے پہلے اپنے حقیقی مالک اللہ تعالیٰ کے سامنے اور پھر ان لوگوں کے سامنے جنہوں نے ان کو یہ عہدہ دیا ہے جوابدہ ہیں۔ ایک اچھی حکومتی نظام کی مشینری کے مختلف حصوں کے صحیح رویہ کی یہ سب سے پہلی ضرورت ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور میں اسی رویہ پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا قرآنی آیات اور احادیث سے مزید پتہ چلتا ہے کہ موروثی بادشاہت کی اسلامی طرز حکومت میں کوئی گنجائش نہیں بلکہ یہ ایک اجنبی خیال ہے۔ یہ ایک شخصی حکومت بھی نہیں ہے کیونکہ سربراہ مملکت کو لامحدود اختیارات نہیں دیئے جاتے۔ مسلمانوں کی عظیم خوبیوں کا اگر ذکر کیا جائے تو ان کا خدا پر ایمان، ہر قسم کی نازیبا حرکات سے اجتناب، ان کا عفو اور درگزر سے کام لینا اور نمازوں کو قائم کرنا چند نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کے علاوہ سب سے بڑی خصوصیت جس کا قرآن مجید ذکر کرتا ہے۔ "ان کا کام آپس میں مشورہ سے ہوتا ہے" (۳۸:۴۲)۔ مشاورت کے اصول کی پابندی کو اتنا ضروری قرار دیا گیا ہے کہ خود نبی کریمؐ کو حکومتی معاملات میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ "پس ان کو معاف کر دو اور ان کے لئے بخشش مانگ اور معاملات میں ان سے مشورہ لے" (۱۵۸:۳) اس طرح سے اسلامی حکومت حقیقی معنوں کی رو سے جمہوری ہے۔ حضرت نبی اکرمؐ کے پہلے جانشین حضرت ابو بکرؓ تھے جن کا انتخاب تمام لوگوں کی متفقہ رائے پر ہوا تھا۔ اسی طرح تین جانشین جو ان کے بعد ہوئے ان کا بھی انتخاب ہوا۔ حکومتی نظام کی کیوں ضرورت پڑی۔ اور سربراہ حکومت کی آئینی حیثیت کیا تھی اس کی وضاحت حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں کر دی۔ "تم نے مجھے خلیفہ (حضرت نبی اکرمؐ کے جانشین یا دنیاوی سربراہ مملکت کے طور پر منتخب کیا ہے) لیکن میں تم پر کسی

فوقیت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ تم میں سب سے زیادہ طاقتور میرے نزدیک سب سے کمزور ہوگا یہاں تک کہ میں اس سے دوسروں کے چھینے ہوئے حقوق واپس لے لوں۔ اور تم میں سب سے کمزور میرے نزدیک سب سے زیادہ طاقتور ہوگا۔ جب تک کہ میں اس کے چھینے ہوئے حقوق اس کو نہ دلادوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر غلط راستہ اختیار کروں تو میری تصحیح کرو۔ میری تابعداری کرو جب تک میں خدا اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کروں۔ اگر میں خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو مجھے تم سے اپنی تابعداری کا کوئی حق نہیں"۔

ریاست کے لئے لوگوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قانون کا احترام کریں۔ اور اس کے احکام کو بجالائیں جب تک وہ خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا حکم نہ دیں (بخاری ۱۰۸:۵۶)۔ ریاست کے ایسے احکام جن سے خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی ہو ان کی فرمانبرداری نہ کی جائے۔ ایک ظالم یا غیر منصف حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا بہترین جہاد ہے اور اس کو بہت بڑی خوبی سمجھا جاتا تھا (مشکوٰۃ ۱۷:۱)۔ ایک جائز اور آئینی حکومت کی مسلسل مخالفت یا بغاوت کی اجازت نہیں۔ جب تک اس میں تم ایک واضح طور پر کفر کی بات نہ دیکھو اور جس کے لئے تمہارے پاس اللہ سے واضح دلیل نہ ہو (بخاری ۹۳:۲)۔ ایسے انتہائی حالات میں خلیفہ کو معزول بھی کیا جاسکتا ہے۔ سربراہ ریاست حکومت اور عوام کا خادم ہوتا تھا اور اس کو عوامی خزانے سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسرے تمام سرکاری ملازمین کی طرح تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے لئے کوئی خصوصی مراعات نہ تھیں۔ اس کی ذاتی حیثیت میں اس کے خلاف عدالت میں عام مسلم شہری کی طرح مقدمہ دائر کیا جاسکتا تھا۔ عظیم خلیفہ وقت حضرت عمرؓ چار مملکتوں کے حکمران تھے ایک مقدمہ میں قاضی کی عدالت میں مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ صوبائی گورنروں کو اور احکام کے علاوہ انہوں نے یہ ہدایت بھی کر رکھی تھی کہ ہر ایک حاکم کے لئے یہ ضروری تھا کہ اگر کسی کو کوئی شکایت ہو تو اس کی شکایت سننے کے لئے ہر وقت اس کے دروازے کھلے ہوں۔ اور ان کے دروازوں پر پہرہ دار نہ ہوں جو ان کو اپنی شکایت پیش کرنے سے منع کریں۔ اور مزید برآں یہ کہ ان کو سادہ اور مشکل زندگی بسر کرنے کا عادی ہونا چاہئے۔ سربراہ حکومت وزیروں کی مدد سے کاروبار حکومت چلاتا تھا۔ تمام اہم ملکی امور کا فیصلہ مجلس شوریٰ کرتی تھی۔

سربراہ مملکت اور اس کے تمام کارندوں کو ہدایت تھی کہ وہ عوام کی بھلائی کے لئے کام کریں۔ ان کا فرض ہوتا ہے کہ عوام کے مفاد میں کام کریں۔ کوئی ایسا شخص نہ ہو جس کو اللہ موقع دے کہ وہ لوگوں پر حکومت کرے تو وہ ان کی بھلائی کے معاملات میں ان کی بھلائی نہ کرے۔ ایسے شخص کو جنت کی میٹھی خوشبو سونگھنا نصیب نہ ہوگا (بخاری ۸:۹۴)۔ ان کو ہدایت تھی کہ وہ لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کریں تاکہ وہ حکومت کے انتظام سے خوشی محسوس کریں اور ان کو کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہئے جو ان کی ناخوشی کا باعث ہو (بخاری ۶۲:۶۴)۔ ان کو سادہ زندگی گزارنے کی ہدایت تھی اور یہ کہ جن کو ان کی ضرورت ہو وہ آسانی سے ان تک پہنچ سکیں (مشکوٰۃ ۱۷:۱)۔ اور یہ کہ وہ خدا کا خوف کرنے والے ہوں (بخاری ۱۶:۹۴)۔ لوگوں پر ان کی حیثیت کے مطابق ٹیکس لگایا جائے اور غیر مسلموں کے حقوق کا احترام اسی طرح کیا جائے جس طرح مسلمانوں کے حقوق کا احترام کیا جاتا ہے (بخاری ۸:۶۲)۔ حکومت پر نہ صرف لاوارث خاندانوں کی دیکھ بھال فرض تھی بلکہ ان کے ذمہ قرضوں کی ادائیگی بھی جو جائز ضرورتوں کے لئے لئے گئے ہوں (بخاری ۱۱:۴۳)۔ جہاں تک دوسری ملکوں سے تعلقات اور امن وجنگ کے معاملات کا تعلق ہے اسلامی ریاست کا یہ اولین فرض تھا کہ جنگ دفاعی ہو اور فراخدلی سے صلح کی جائے۔ جنگ بعض حالتوں میں ناگزیر ہو جاتی ہے لیکن یہ واضح اصول قائم کیا گیا کہ حد سے تجاوز نہ کیا جائے صرف اور صرف دفاع میں جنگ کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ "اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں (۹۰:۲)۔ اور دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے۔ "ان لوگوں کو (جنگ کی) اجازت دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا (۳۹:۲۲)۔ یہاں ذرا سا شک بھی نہیں چھوڑا گیا کہ اسلام جارحیت کے لئے جنگ کی اجازت دیتا اور نہ ہی توسیع پسندی کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ اور نہ ہی انا کی تسکین کے لئے جنگ کرنے کی اجازت ہے۔ اسلام صرف ایک ہی صورت میں جنگ کی اجازت دیتا ہے جب اس پر حملہ کیا جائے۔ اور اس حالت میں بھی اگر دشمن صلح کرنا چاہے تو صلح ضرور کرلینی چاہئے۔ اسلام کے دشمن اسلامی ریاست کو ختم کرنے کے لئے حملہ کرتے تھے۔

ارشاد ربانی ہے "اور وہ ہمیشہ تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تم کو تمہارے دین سے لوٹا نہ لیں اگر ان میں طاقت ہو (۲۱۷:۲)۔ لیکن اگر ایسا دشمن بھی امن چاہے تو مسلم ریاست اس سے انکار نہیں کرسکتی۔ "اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی اس کی طرف جھک جا اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھ (۶۱:۸)۔ صلح کی تجاویز غیر مخلصانہ بھی ہوسکتی ہیں۔ یہ صرف دوسری جنگ کی تیاری کے لئے وقت لینے کے لئے بھی ہوسکتی ہیں۔ تاہم پھر بھی امن کو ترجیح دی جائے "اگر ان کا ارادہ ہو کہ تجھے دھوکا دیں تو یقیناً مجھے بس ہے" (۶۲:۸)۔ مسلمانوں کا اللہ پر ایمان ان کے لئے اس بات کی ضمانت تھی کہ اگر دشمن دوبارہ جنگ کے لئے آئے گا تو شکست کھائے گا اور صلح کی درخواست کرے گا۔

اس قسم کی جنگ رحم کا نمونہ تھی اس کا آغاز بھی رحم سے ہوتا تھا کیونکہ یہ اپنے دفاع کے لئے لڑی جاتی تھی کیونکہ وہ جارح کے ظلم سے بچنے کے لئے کی جاتی تھی جو ان کو ملیامیٹ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اور اس کا انجام بھی رحم پر ہوتا تھا اس لئے کہ جب جارح امن کی درخواست کرتا تھا تو جنگ بند کردی جاتی تھی۔ اس کا مقصد تو مجبور و مظلوم لوگوں کی حفاظت تھا نہ کہ

جارح کی بربادی۔ جنگ میں حصہ نہ لینے والے کے لئے بھی یہ رحم کا موجب ہوتی تھی۔ جو نام نہاد مہذب جنگوں میں جنگ میں حصہ لینے والوں کی نسبت زیادہ جنگ کی زیادتیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اسلامی جنگوں میں خصوصی ہدایت تھی کہ جنگ میں حصہ نہ لینے والوں کو قتل نہ کیا جائے (بخاری ۵۶:۱۴۷)۔ اور پھر یہ بھی کہ جارح کو بھی تباہ و برباد کر دینا بھی مقصود نہ تھا۔ کیونکہ جارحیت کا خاتمہ ہی صرف اس کو روکنے کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات فراخدلانہ امن کا معاہدہ اس کے خاتمے سے زیادہ بہتر اصلاح کا موجب ہوتا ہے۔ کسی قوم کو بالکل ختم کر دینے سے مفتوح قوم میں انتقام کی آگ کو ہوا دینے کے مترادف ہوتا ہے جبکہ فراخدلانہ معاہدہ امن شاید دلوں میں تبدیلی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسلام جارح کی امن و صلح کی طرف رجوع کو رد کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

حضرت نبی اکرمؐ نے اپنے دشمنوں سے ایسا ہی فراخدلانہ سلوک روا رکھا۔ اکیس سال کے لمبے عرصے تک آپؐ اپنے دشمنوں کے ہاتھوں انتہائی ظلم و تشدد جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا برداشت کرتے رہے۔ وہ اور ان کے پیروکاروں کی جماعت کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ مکہ کے طاقتور جنگجو دشمنوں نے ان کے نئے گھروں پر بھی حملہ کیا۔ جبکہ وہ وطن چھوڑ کر دور ایک شہر مدینہ میں امن کی تلاش میں پناہ لے چکے تھے۔ دشمنوں نے مدینہ پر تین دفعہ مسلمانوں کے چھوٹے سے گروہ کو ملیا میٹ کرنے کے لئے طاقتور فوجوں کے ساتھ چڑھائی کی جہاں وہ امن سے رہ رہے تھے۔ لیکن جب ان جارحیت کرنے والے ظالموں کو فتح مکہ کے موقعہ پر سزا دینے کا وقت آیا جبکہ وہ حضرت نبی اکرمؐ اور ان کے ساتھیوں کے رحم و کرم پر تھے تو ان کا انتقام کی بجائے محبت کے پیغام سے فراخدلی سے استقبال کیا گیا۔ "آج کے دن میں کوئی ملامت نہیں"۔ اس فراخدلانہ حسن سلوک نے خون کے پیاسے دشمنوں کے دلوں کو تبدیل کر دیا اور ان کو پکے اور سچے دوستوں میں بدل دیا۔ آج دنیا کو ایسے ہی امن کی ضرورت ہے۔ لیکن ایسے امن کی پیشکش صرف ایسی ہی حکومت کر سکتی ہے جو اسلامی اصولوں پر تشکیل دی گئی ہو۔

اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے جہاد کے متعلق بہت غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اس کے لفظی معانی میں دشمن کو طاقت کے ذریعہ پیچھے دھکیلنا یا کسی ناپسندیدہ بات کی مخالفت کرنا ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی دین کو پھیلانے کے لئے جدوجہد اور اپنے مذہب کی حفاظت کے لئے جسمانی طاقت کا استعمال کرنا۔ تمام مسلمانوں کا فرض اولین ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اور یہ فرض تمام مسلمانوں کا مستقل فرض ہے جبکہ دوسرا فرض ایسا ہے جو بعض مخصوص حالات کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید اور حدیث پُر زور اور واضح الفاظ میں دونوں قسم کے جہاد کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ ایک جہاد کبیرہ یعنی وہ ایک بڑا جہاد ہے جو قرآنی الفاظ کے مطابق منکرین کے خلاف ہمیشہ جاری و ساری رہنا چاہئے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ "ان کے خلاف سخت کوشش (جاہدھم) کی جائے یعنی اس قرآن کے ساتھ ان سے وہ جہاد کر جو بڑا جہاد ہے (۲۵:۵۲)۔ اس لئے اسلام کا بڑا جہاد تلوار سے نہیں بلکہ قرآن کے ذریعہ اس کی تعلیمات کی اشاعت ہے۔ دوسرے لفظوں میں تمام اقوام تک مشنری جذبہ کے ساتھ اسلام کا پیغام پہنچانا۔ اس لئے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمانوں میں ہر وقت ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو لوگوں کو اسلام کی دعوت دے۔ "اور چاہئے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائے اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں" (۳:۱۰۴)۔

بلاشبہ جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن یہ صرف دفاعی مقاصد کے لئے اور وہ بھی صرف ان لوگوں کے خلاف جو تلوار کے ساتھ اسلام کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ تلوار کے ذریعہ اسلام دوسروں پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ مذہبی معاملات میں جبر یا زبردستی صاف الفاظ میں ممنوع قرار دی گئی ہے۔ "اسلام میں جبر نہیں ہے" (۲:۲۵۶)۔ حضرت نبی اکرمؐ کی زندگی کا ایک واقعہ بھی بطور مثال پیش نہیں کیا جا سکتا کہ کسی قوم کو مسلمان کرنے کے لئے کوئی مہم بھیجی گئی ہو یا کسی فرد واحد کو تلوار کی نوک پر اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں ایران سے جنگ کے دوران حضرت عمرؓ نے کہا تھا "میری خواہش ہے کہ عراق اور پہاڑوں کے پار کے ملکوں کے درمیان رکاوٹ کھڑی کر دی جائے تاکہ ایرانی ہم پر حملہ نہ کر سکیں اور نہ ہی ہم ان تک پہنچ سکیں"۔ میور بھی تسلیم کرتا ہے "کہ مذہبی جنگوں کے ذریعہ اسلام کو پھیلانے کو بطور فرض عام خیال ابھی تک مسلمانوں کے ذہن میں نہ آیا تھا۔" اگر ایسا خیال مسلمانوں کو حضرت نبی اکرمؐ کی زندگی اور ابتدائی خلافت راشدہ کے زمانہ میں مسلمانوں کے ذہنوں میں نہ آیا تو یہ تصور یقیناً غیر اسلامی ہے۔ (ختم شد)

انگریزی سے ترجمہ

ممتاز احمد باجوہ ایم اے، ایم ایڈ

اسلام کا تعارف ـــ ۳

نوجوانوں کے لئے اسلام پر ابتدائی نوعیت کے یک صد سوالات کے جوابات

مرتبہ: ڈاکٹر زاہد عزیز۔ انگلستان

۳۴- کیا قرآن مجید میں مذکور پیغمبروں کے علاوہ بھی کوئی پیغمبر دنیا میں مبعوث ہوئے؟

یقیناً قرآن کریم خود ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے صرف چند پیغمبروں کے ناموں کا ذکر کیا ہے (۱۶۴:۴)۔ پیغمبر تو دنیا میں ہر جگہ مبعوث ہوئے ہیں اور پھر ہر قوم میں کئی پیغمبر گزرے ہیں۔ ان سب کی مکمل فہرست کا ذکر نا ممکن تھا۔ مسلمانوں کو ان تمام پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان سب کی عزت کرنی ہے۔ خواہ ان کے نام قرآن مجید میں درج ہیں یا نہیں۔

۳۵- یہ تو ایک مسلمہ بات ہے کہ مسلمان تمام اسرائیلی نبیوں جن میں حضرت عیسیٰؑ شامل ہیں پر ایمان لاتے ہیں لیکن ان کے علاوہ وہ دوسرے مذاہب کی عظیم شخصیات مثلاً کرشن جی، مہاتما بدھ اور کنفیوسش کا کس حد تک احترام کرتے ہیں؟

قرآن کریم کی تعلیمات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام قوموں کی طرف پیغمبر بھیجے اور پوری دنیا میں ان کی بہت بڑی تعداد مبعوث ہوئی۔ دوسرے مذاہب کے تمام بانیان بھی خدا کے پیغمبر اور رسول ہی ہوں گے۔ حقیقت میں جہاں کہیں بھی لوگ مقدس صحیفوں کی جو قرآن مجید سے پہلے نازل ہوئے ان کی پیروی کرتے ہیں ان مذاہب کے بانی جن کا ان کتب میں ذکر ہے ان کو بھی خدا کے پیغمبر اور رسول تسلیم کرنا چاہئے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ان کے ماننے والوں نے ان کی تعلیم کو بگاڑ دیا۔ بعض مفکرین اسلام نے ذوالکفل سے مراد مہاتما بدھ لیا ہے۔ یعنی کفل کا رہنے والا۔ کفل عربی زبان میں حضرت بدھ کی جائے پیدائش کپل وستو کی ہی ایک شکل ہو سکتی ہے۔

۳۶- کچھ مذاہب جیسے عیسائیت اور ہندو ازم اپنے مذہبی شخصیات کا احترام خدا یا دیوتا کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ اسلام اس کے متعلق کیا کہتا ہے؟

اسلام کے نزدیک یہ تمام خدا رسیدہ لوگ فانی انسان تھے جنہیں خدا نے پیغمبر بنا کر دنیا میں لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ بالکل اسی طرح حضرت محمدؐ تھے۔ ان کی وہی ضروریات زندگی تھیں جس طرح دوسرے انسانوں کو ہوتی ہیں۔ آخر کار وہ بھی تمام وفات پا چکے ہیں۔ جس طرح ہر ایک کو مرنا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان کے پیروکاروں نے ان کو خدا یا دیوتا کا درجہ دیا۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ آئندہ آنے والی نسلوں نے ان کے الفاظ کا مفہوم غلط سمجھا۔ ان کی تمثیلات کو لفظی معنے دے کر غلط مفہوم لیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی زندگی کی تفصیلات صحیح طور پر محفوظ نہ رہ سکیں اور اس لئے ان شخصیات کی عظمت کو بڑھانے کے لئے ان کے کام اور زندگی کی معمولات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا۔

۳۷- پیغمبر کیوں انسان تھے اور کیوں دیوتا نہیں تھے۔

چونکہ ان کو انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا اور انہیں تبلیغ اور عملی نمونہ کے ذریعہ یہ فرض ادا کرنا ہوتا تھا اس لئے ایسا تو انسان کے طور پر ہی کر سکتے تھے تاکہ لوگوں کو اس دنیا میں زندگی گذارنے کا طریقہ بتا سکیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر پیغمبر خود خدا تعالیٰ کی ہدایت کا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فرمانبردار اور پابند تھا جو اس پر وحی کے ذریعہ لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سابقہ انبیاء کو قرآن کریم نے مسلمان کہا ہے۔ یعنی احکام خدا کی فرمانبرداری کرنے والے۔ یہ لوگ صرف خدا کی ہدایت کے معلم تھے بلکہ سب سے زیادہ فرمانبردار بھی تھے۔ (ملاحظہ کریں ۶۷:۳)۔ اور جہاں تک نبی پاک حضرت محمدؐ کا تعلق ہے اسلام ہمیں واضح طور پر بتاتا ہے کہ وہ نہ صرف انسان تھے بلکہ ان کی زندگی کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک عاجز انسان سمجھتے تھے اور لوگوں میں گھل مل جاتے تھے کہ جیسے انہی میں سے ہیں۔

۳۸- پیغمبر لوگوں کو کیا تعلیم دیتے تھے؟

ان تمام کی بنیادی تعلیم ایک ہی تھی کہ خدا کی عبادت کریں اور اپنے ہم جنسوں سے نیکی کریں۔ بے شک تعلیم کی تفصیلات ہر قوم اور وقت کی

ضرورت کے مطابق مختلف ہوتی تھیں۔ جس میں وہ نبی مبعوث ہوتا تھا۔ قرآن مجید میں تمام انبیاء کی تعلیمات کو اسلام کہا گیا ہے۔ پیغمبروں اور ان کے صحیح پیروکاروں کو مسلمان کا نام دیا گیا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں ۲:۱۳۱۔۱۳۳ اور ۵:۱۱۱)۔ اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ بنیادی تعلیمات جو ان سب پیغمبروں نے دیں ایک جیسی تھیں۔ یعنی خدا تعالیٰ کی تابعداری، اپنے ہم جنسوں سے ہمدردی اور سلامتی کا سلوک۔

۳۹۔ جب مسلمان تمام پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں تو نبی پاک حضرت محمدؐ کی منفرد اور خصوصی حیثیت کیا ہے؟

تمام پیغمبر خدا تعالیٰ کی طرف سے تھے اور سب سچے تھے لیکن ان کی تبلیغ کے حلقہ اثر مختلف تھے۔ حضرت نبی کریمؐ سے پہلے خدا کی طرف سے مبعوث ہونے والوں نے جو تعلیم دی وہ ان کی قومی ضروریات تک محدود تھیں کیونکہ ان وقتوں میں ایک قوم کو دوسری قوم سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں ہر نبی اور رسول کی تعلیم صرف ایک محدود وقت تک ہوتی تھی۔ جس کے بعد خدا تعالیٰ کسی دوسرے پیغمبر کو کھڑا کر دیتا تھا جو خدا کے حکم سے گذشتہ تعلیمات کو وقتی ضروریات وحالات کے مطابق تبدیل کر دیتا تھا۔ آخر کار وہ وقت آگیا کہ تمام قوموں کو ایک مذہب پر متحد کیا جائے تاکہ انسانیت ایک قوم کی حیثیت سے امن میں رہ سکے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے حضرت محمدؐ تمام دنیا کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے بھیجے گئے۔

۴۰۔ کیا آپ اس عقیدے کی تائید میں کوئی دلیل دے سکتے ہیں؟

ہاں! پہلی دلیل یہ ہے کہ سابقہ مذاہب کے پیروکار یہ مانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی وحی اور ہدایت صرف ایک خاص قوم اور خاص علاقہ کو دی گئی تھی۔ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہر قوم کی طرف آئی۔ اور یہ فرض قرار دیتا ہے کہ ہر مسلمان تمام سابقہ قومی پیغمبروں پر ایمان لائے۔ پس نبی پاک حضرت محمدؐ وہ نبی ہیں جنہوں نے تمام مختلف قوموں کے انبیاء کی سچائی کو قائم کیا اور ان کی تصدیق کی اور ان کے درمیان امن اور اتحاد کی بنیاد رکھی۔ اس طرح سے وہ تمام قوموں اور لوگوں کے لئے پیغمبر ہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گذشتہ انبیاء کی صحیح تعلیمات محفوظ نہ رہ سکیں۔ اس کے بالمقابل اسلامی تعلیمات کے ماخذ یعنی قرآن کریم اور نبی کریمؐ کی زندگی کی تفصیل اور حالات ہمارے پاس صحیح اور مکمل طور پر موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام تمام وقتوں کے لئے دین ہے۔

۴۱۔ کیا نبی پاک حضرت محمدؐ کے بعد بھی کوئی پیغمبر یا رسول ہو سکتا ہے؟

نہیں۔ حضرت محمد نبی کریمؐ کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی یا رسول نہیں آسکتا۔ وجوہات واضح ہیں جو اوپر بیان ہو چکی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے جو تعلیمات حضرت نبی پاکؐ پر نازل فرمائیں وہ تمام اقوام کے لئے ہیں تاکہ تمام دنیا ایک ہمہ گیر بھائی چارے میں متحد ہو سکے۔ یہ تعلیمات مکمل طور پر محفوظ ہیں۔ پس نبی کریم حضرت محمدؐ کے بعد کسی نبی کی ضرورت ہی نہیں۔

۴۲۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی انسان خدا تعالیٰ سے قریبی رابطے کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا کہ خدا اس سے کلام کر سکے؟

نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں۔ اس کا سادہ مطلب یہی ہے کہ اب کوئی نیا دین یا نئی کتاب یا نیا پیغمبر دنیا میں نہیں آئے گا۔ اب ایسے لوگ امت مسلمہ میں پیدا ہوتے رہیں گے جو نبی کریم صلعم کے بعد ان کی تعلیمات کی مکمل پیروی کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے ایسا قریبی تعلق قائم کریں گے کہ وہ ان سے کلام کرے گا۔ ان کو تسلی دے گا اور ان پر مستقبل کے واقعات قبل از وقت ظاہر کرے گا۔ یہ ہمکلامی الفاظ کے ذریعہ سچے خوابوں اور رویا وغیرہ کے ذریعہ سے ہوگی۔ اسلامی تاریخ میں اس قسم کے سچے لوگ لاتعداد گزرے ہیں جو اس بلند روحانی مقام پر اسلامی تعلیمات پر پوری طرح عمل کر کے پہنچے اور آئندہ بھی ایسے لوگ ہوتے رہیں گے۔ ایسے لوگوں کو ولی کہا جاتا ہے۔

خدا کی کتابیں

"مسلمان وہ ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا" (۲:۴)۔

"(اے محمدؐ) اس نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے ہے اور توریت اور انجیل کو لوگوں کو راہ دکھانے کے لئے پہلے سے نازل کیا اور حق وباطل کا فیصلہ اتارا" (۳:۳،۴)

۴۳۔ خدا کی کتاب سے کیا مراد ہے؟

خدا تعالیٰ نے لاتعداد نبیوں کو لوگوں کی راہنمائی کے لئے بھیجا۔ اور ان پر وحی کے ذریعہ تعلیمات نازل کیں۔ پیغمبروں نے ان تعلیمات سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ ان کے پیروکاروں نے ان کو سیکھا اور ان کو اپنے بچوں

تک پہنچایا اور پھر انہوں نے اپنی باری پر ان تعلیمات کو اگلی نسل میں منتقل کیا اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس طریق پر صحیفے اور مقدس کتب ہم تک پہنچیں جو غیر محفوظ شکل میں آج مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے پاس موجود ہیں۔ اسلام دیگر پیغمبروں کی صحیح اور اصلی وحیوں کو خدا کی کتب کہتا ہے۔ جو لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہیں۔ قرآن مجید میں یہ تعلیمات اور سچائیاں یکجا صورت میں محفوظ کر دی گئیں ہیں گو موجودہ صورت میں مقدس صحیفے وہ ہیں جو زبانی روایات یا تحریروں کو اکٹھا کیا گیا ہے۔

۴۴۔ مہربانی سے اس وقت موجود چند الہامی کتب کے نام تحریر کریں۔

جو وحی اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم حضرت محمدؐ سے پہلے مثلاً حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت کرشنؑ، حضرت مہاتما بدھؑ وغیرہ پیغمبروں کو عطا فرمائیں وہ صحیح اور اصلی حالت میں دستیاب نہیں۔ تاہم ان عظیم انبیاء کے ماننے والوں کے پاس جو مقدس کتب اس وقت موجود ہیں ان میں اصل تعلیمات کے کچھ حصے اب بھی موجود ہیں۔ اگرچہ دنیا میں بعد میں ہونے والی تبدیلیوں اور خود ساختہ تشریحات کو اصلی وحی کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض صحیفوں کے نام یہ ہیں۔ یہودیوں کی تورات، عیسائیوں کی انجیل، ہندوؤں کی وید، زرتشتیوں کی زنداوست۔

لیکن خدا کی ہدایت اور وحی جو نبی پاک حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی وہ صحیح طور پر پوری طرح محفوظ قرآن مجید کی شکل میں موجود ہے۔

۴۵۔ کیا مسلمان کو اپنے صحیفے (قرآن مجید) کے علاوہ دیگر صحیفوں پر ایمان لانا ضروری ہے؟

مسلمانوں کو اس بات پر ایمان لانا ضروری ہے کہ تمام انبیاء جن میں حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ ہندوستان اور چین کے سبھی نبی شامل ہیں ان کی اصل تعلیمات خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی بذریعہ وحی ان کو ملی تھیں۔ اس بنیاد پر وہ دوسرے مذاہب کی کتب مقدسہ کا احترام کرتے ہیں اور مسلمانوں کا اس پر ایمان لانا ضروری ہے کہ اسلام سے قبل آنے والے تمام مذاہب کے بانیوں پر وحی خدا کی طرف سے نازل ہوئی۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ان مذاہب کی موجودہ کتب کو خدا کی سچی تعلیم مانتے ہیں۔ جیسے یہودیت، عیسائیت، ہندوازم، بدھ ازم، وغیرہ۔

۴۶۔ قرآن پاک کا دوسری مقدس کتب میں کیا مقام ہے؟

(i) گذشتہ کتب کی تصدیق کرنے والا: ایک کتاب اللہ کی طرف سے آئی اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو ان کے پاس ہے (۲:۸۹)

(ii) ان پر نگہبان (حفاظت کرنے والی) (۵:۴۸)

(iii) ان کے اختلافات کا فیصلہ کرنے والی: "ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ وہ ان کے لئے وہ باتیں کھول کر بیان کرے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

(iv) ان کی تعلیمات کو کھول کر بیان کرنے والی" (۱:۲۶) اور تکمیل کرنے والی (۵:۳)

۴۷۔ مہربانی فرما کر مندرجہ بالا چار نکات کی مزید وضاحت کریں۔

(i) قرآن کریم تصدیق کرتا ہے کہ تمام پرانے صحیفے جو دنیا کی مختلف قوموں کی طرف وحی کئے گئے ان کا سرچشمہ خدا ہی ہے۔

(ii) اس کی وجہ اس نے ان کے متروک ہونے، اصل متن میں تحریف ہو جانا اور گم ہو جانا بیان کیا ہے۔ قرآن مجید نے ان کی اصل تعلیمات کو محفوظ کر لیا ہے، جو ہمیشہ رہنے کے قابل تھیں۔

(iii) تمام صحیفے خدا تعالیٰ کی طرف سے تھے لیکن وہ اتنے تبدیل ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کی بنیادی تعلیمات بھی بدل گئیں۔ قرآن کریم ان کے اختلاف کے متعلق فیصلہ کرتا ہے اور گذشتہ صحیفوں میں بعد ازاں ہونے والی تبدیلیوں کو اصل تعلیمات سے الگ کرتا ہے۔

(iv) قرآن کریم مذہب کے تمام ضروری پہلوؤں پر مکمل روشنی ڈالتا ہے۔ پہلے صحیفوں میں ان میں سے بہت سی باتوں کے متعلق پوری طرح بیان درج نہ تھا۔ قرآن مجید نے ان تعلیمات کو جو وقتی اور عارضی تھیں مکمل کیا تاکہ یہ تمام قوموں اور تمام وقتوں اور زمانوں کے لئے کار آمد ہو۔

روحانی مدارج حاصل کرنے میں ارکان اسلام کی اہمیت

خطبہ عید الفطر جو ناصر احمد صاحب نے جامع دار السلام، لاہور میں ۶ جنوری ۲۰۰۰ء کو دیا

"اسلام اتنا آسان مذہب نہیں۔ روزوں کی پابندی، دن اور رات میں پانچ مرتبہ نماز با جماعت کا اہتمام، جسم اور لباس کی پاکیزگی کا خیال رکھنے کا حکم، شراب سے کلیتاً پرہیز۔ یہ وہ احکام و فرائض ہیں جن پر عمل کرنے کا ہر مسلمان کو حکم دیا گیا ہے۔ ان سخت پابندیوں پر نظر ڈالنے کے بعد یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام لوگوں میں اس لئے مقبول ہوا کہ وہ اپنے پیروکاروں کے لئے آسانیاں فراہم کرتا ہے۔ صرف اسلام پر ہی منحصر نہیں دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو محض اس لئے مقبول ہو گیا ہو کہ اس پر عمل کرنا آسان تھا۔ میرے خیال میں یہ کہنا نسل آدم کی توہین ہے کہ انسان محض عیش و عشرت، صلہ کے لالچ یا شراب و شہد کی خاطر اعمال نیک سرانجام دیتا ہے...... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نسل آدم کے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ فرد کا دل بھی جس چیز کی تمنا سے سرشار رہتا ہے وہ لذتِ کام و دہن نہیں، بلکہ شریفانہ اور پاکیزہ زندگی گذارنے کا وہ جذبہ ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان اللہ کے ایک نیک بندے کی حیثیت سے اللہ کی جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔" ("رسول کریم" تھامس کارلائل، ترجمہ از پیام شاہجہانپوری ص ۸۵-۸۶)

"رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لئے ہدایت اور اس میں ہدایت اور حق و باطل کو الگ کر دینے کی کھلی دلیلیں ہیں۔" (۲:۱۸۵)

"اور جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو میں قریب ہوں۔ میں دعا کرنے والے کی دعا کو جب وہ مجھے پکارتا ہے قبول کرتا ہوں۔ پس چاہئے کہ میری فرمانبرداری کریں اور چاہئے کہ مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں۔" (۲:۱۸۶)

"اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور نہ ان کے ذریعہ حاکموں تک پہنچو۔ تاکہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ۔ حالانکہ تم جانتے ہو۔" (۲:۱۸۸)

اسلام نے مسلمانوں کے لئے دو تہوار مقرر کئے ہیں یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ یہ تہوار بظاہر دیگر تہواروں کی طرح خوشی، شادمانی اور جشن کا سا رنگ رکھتے ہیں لیکن مسلمانوں کے لئے ان تہواروں کے منانے کا مقصد محض خوشی یا رنگ رلیاں کرنا نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ایک روحانی تربیت کے پروگرام کی تکمیل پر خدا کا شکر ادا کرنا ہے۔ ایک ماہ کی روحانی تربیت کا مقصد ایک مسلمان کے اخلاق و کردار میں حسن معاشرت، دوسروں کی تکالیف کا احساس اور ان کے لئے جذبہ قربانی کے تحت عملی اقدام کرنا ہے۔ یہی وہ اعلیٰ مقام ہے جہاں دین اسلام اپنے ماننے والوں کو پہنچانا چاہتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ یعنی یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے (۹۵:۴)۔ حضرت ڈاکٹر بشارت احمد صاحب نے اپنی خوبصورت تفسیر "انوار القرآن" میں انسان کی ادنیٰ اور اعلیٰ حالت کا نہایت خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں:

"انسان کے افعال میں نیکی و بدی دونوں دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ اگر ایک طرف اس کے اندر نیکی و شرافت کے لطیف جذبات نظر آتے ہیں تو دوسری طرف درندگی و بہیمیت کی خوفناکی بھی نظر آتی ہے۔ اگر وہ فرشتوں کی طرح محبت اور احسان کی آنکھیں رکھتا ہے تو دوسری طرف بھیڑیوں اور بچھوؤں کی طرح اس کے پاس حرص و خود غرضی کے پنجے اور خونریزی و سفاکی کے ڈنگ بھی ہیں ..... یہی انسان ہے جو رات کو دروازوں پر پاسبانی کرتا ہے تاکہ دوسرے لوگ گھر کے اندر امن و سکون سے سوئیں۔ تو یہی انسان ہے کہ دوسری طرف سے آکر مکان میں چوری اور ڈاکہ کی غرض سے گھس آتا ہے تاکہ دوسروں کو دکھ اور نقصان پہنچائے۔" ("رسول کریم" ص ۱۱۵)

خواتین و حضرات! اگر دنیاوی زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لئے سالوں کی محنت اور تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے تو انسان کا اندرون یا ذہن یا قلب جو مرکز ہے اس کی تمام فکر کا، جو محرک ہے اس کے تمام افعال کا۔ اس کی تعلیم و تربیت کی اس کی ظاہری تعلیم و تربیت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے یَاَیُّھَا

النَّاسُ قَدْ جَاءَ تْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰:۵۷) اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے اور اس کے لئے شفا ہے جو سینوں میں ہے اور یہ مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

جیسا کہ میں نے ماہ رمضان کے شروع میں ایک خطبہ جمعہ میں بیان کیا تھا کہ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اسلام کے روحانی تربیتی پروگرام کے مختلف مراحل ہیں جو انسان کے خالق اور خالق کائنات نے انسان کی تربیت کے لئے تجویز کئے ہیں اور جن سے گزر کر انسان درجہ بدرجہ اخلاق و کردار میں ترقی کرتا اور خدا کا قرب حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ روزہ میں اگر ایک طرف بندہ اپنے خالق کی فرمانبرداری کا دم بھرتا ہے اور اس ماہ مبارک میں عبادات اور وردِ قرآن کے ذریعہ اپنے قلب و نظر کو برے خیالات سے پاک کر کے نیک اور اعلیٰ خیالات اور ارادوں کو جاگزیں کر لیتا ہے تو دوسری طرف انسان دوسروں کی تکلیف کا احساس کرتا اور ان کو دور کرنے کے لئے صدقہ، فطرانہ اور دیگر ہمدردی اور شفقت کے طریق اختیار کرتا ہے تاکہ دلوں سے کبر، نفرت، حسد اور طبقاتی تفریق کو مٹا کر انسانی تعلقات میں باہم محبت اور خوشگواری پیدا ہو۔ جیسا کہ روزہ کی فرضیت کے سلسلہ میں یہ حکم ہے کہ اگر کوئی روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تب بھی اسے ایک مسکین کو کھانا کھلانا ضروری ہے۔ یہ کھانا کھلانا کسی ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنے کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔ اپنے اور غیروں سے ہمدردی اور خیر خواہی کا یہ رویہ اسلامی تعلیمات کی روح ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں متعدد احکامات اور رسول اکرم صلعم کی زندگی میں بے شمار روشن مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن مجید انسانوں سے ہمدردی اور شفقت کے حلقہ کو والدین اور رشتہ داروں سے شروع کر کے مسافر تک کو اس میں شامل کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔ اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پاس والے ساتھی اور مسافر اور ان کے ساتھ بھی جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے یعنی تمہارے ماتحت۔ اور اللہ اسے پسند نہیں کرتا جو تکبر کرنے والا فخر کرنے والا ہے۔ (۳۶:۴)

اس سے اگلی آیت میں حسن سلوک اور ہمدردی کے معاملے میں غفلت برتنے والوں کے لئے سخت تنبیہ آئی ہے۔ فرمایا:

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اور خدا کے احکام کے انکار کرنے والوں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۳۷:۴)

تو محترم بھائیو اور بہنو! روزہ بے لوث انسانی ہمدردی کے جذبہ کو پروان چڑھانے کے لئے تربیت کا ایک ایسا پروگرام ہے جس کے ذریعہ انسان نہ صرف خود بھوک اور پیاس کی کیفیت سے گزرتا ہے بلکہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم سے کوئی درشت کلامی کرے یا جھگڑے کی بات کرے تو کہہ دو کہ بھئی میں تو روزہ سے ہوں یعنی ایک رنگ میں روزہ دار اپنے جذبات کو ایسے موقعوں پر روک لیتا ہے اور ضبط اور تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس وقت ضبط نفس، صبر اور حسن سلوک کی تفصیلات میں جانے کا وقت نہیں۔ میں صرف حضرت سلمان فارسیؓ کی ایک لمبی روایت کا کچھ حصہ بیان کر دیتا ہوں جو ماہ رمضان کے مقاصد اور اس کی برکات کو سادہ لیکن جامع الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کے آخری دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مخاطب کر کے فرمایا: اے لوگو، ایک عظمت والا اور برکت والا مہینہ تم پر سایہ فگن ہے۔ اس مہینہ میں ایک رات ہے جو ہزار ماہ سے بہتر ہے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غمگساری کا مہینہ ہے۔ اس مہینہ کا پہلا عشرہ رحمت ہے، دوسرا عشرہ مغفرت کا اور تیسرا دوزخ کی آگ سے نجات کا۔ جس نے اپنے خادم اور نوکر سے اس مہینہ میں کام کم لیا۔ اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا اور اسے دوزخ کی آگ سے بچائے گا۔"

خواتین و حضرات! اس پوری روایت کا یہ ٹکڑا کہ "جس نے اپنے خادم اور نوکر سے اس مہینہ میں کام کم لیا اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا۔" ہماری خاص توجہ کو چاہتا ہے۔ اس میں بانی اسلام، رحمت للعالمین نے سماجی استحصال کے ادنیٰ طریق سے بھی منع فرمایا ہے: یعنی یہ رویہ کہ ہم اپنے آرام کے لئے دوسروں کی تکلیف کا احساس نہ کریں ایسا کرنا اسلامی

تعلیمات کی روح کے خلاف ہے۔ روزہ سماجی بھلائی اور اپنے سے کمزور اور ماتحت لوگوں سے حسن سلوک اور شفقت کے برتاؤ کا سبق دیتا ہے۔

میں نے اپنے گزشتہ خطبہ میں انگلستان کے ایک نہایت بلند پایہ عیسائی مفکر و فلاسفر اور مصنف تھامس کارلائل کے لیکچر بعنوان Hero as Prophet جس میں اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بحیثیت ایک "مرد عظیم" ان کی خصوصیات اور نظریات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ آپ کو اس کا یہ اقتباس سنایا تھا۔

"مجھے حضرت محمد صلعم کے ارشادات میں سے آپؐ کا یہ ارشاد بہت پسند آیا۔ آپ صلعم فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا کر دیا اگر وہ تمہیں اس جذبہ سے محروم رکھتا تو تمہارا کیا حال ہوتا۔"

بلاشبہ ان الفاظ میں ایک ایسا خیال پیش کیا گیا ہے جو نہایت اعلیٰ اور نادر ہے۔ اشیاء اور معاملات کو حقیقت بینی سے دیکھنے کی یہ ایک اچھوتی مثال ہے۔" (رسول کریم از پیام شاہجہانپوری ص ۸۳)

آج میں آپ کو اسی عیسائی مفکر کے ارکان اسلام کے متعلق خیالات سناتا ہوں تاکہ آپ کو اسلام کی اس روحانی تربیت کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے جس کا حکم قرآن مجید اور اسوہ رسول اکرم صلعم نے مختلف طریق اور مختلف انداز میں دیا ہے اور خالق کائنات نے ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ کیسی عظیم نعمت عطا فرمائی ہے۔ کارلائل کہتا ہے:

"اسلام اتنا آسان مذہب نہیں۔ روزوں کی پابندی، دن اور رات میں پانچ مرتبہ نماز باجماعت کا اہتمام، جسم اور لباس کی پاکیزگی کا خیال رکھنے کا حکم، شراب سے کلیتاً پرہیز۔ یہ وہ احکام و فرائض ہیں جن پر عمل کرنے کا ہر مسلمان کو حکم دیا گیا ہے۔ ان سخت پابندیوں پر نظر ڈالنے کے بعد یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام لوگوں میں اس لئے مقبول ہوا کہ وہ اپنے پیروکاروں کے لئے آسانیاں فراہم کرتا ہے۔ صرف اسلام پر ہی منحصر نہیں دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو محض اس لئے مقبول ہو گیا ہو کہ اس پر عمل کرنا آسان تھا۔ میرے خیال میں یہ کہنا نسل آدم کی توہین ہے کہ انسان محض عیش و عشرت، صلہ کے لالچ یا شراب و شہد کی خاطر اعمال نیک سرانجام دیتا ہے..... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نسل آدم کے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ فرد کا دل بھی جس چیز کی تمنا سے سرشار رہتا ہے وہ لذت کام و دہن نہیں، بلکہ شریفانہ اور پاکیزہ زندگی گذارنے کا وہ جذبہ ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان اللہ کے ایک نیک بندے کی حیثیت سے اللہ کی جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔" (ایضاً ص ۸۵-۸۶)

خواتین و حضرات! عیسائی مفکر نے شریفانہ اور پاکیزہ زندگی کو اللہ کی جنت کا نام دیا ہے۔ روزہ ایسی ہی پاکیزہ زندگی گذارنے کے لئے تربیت فراہم کرتا ہے۔ روزہ میں اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرنے کا جذبہ مختلف طریق پر نشوونما پاتا ہے اور بندہ ہر قدم پر خدا کی حاکمیت اور عظمت کا اقرار کرتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری اس کی روح میں رچ بس جائے۔ مثلاً روزہ کی نیت کے الفاظ کو ہی لیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی لَکَ صُمْتُ وَ بِکَ اٰمَنْتُ وَ عَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَ عَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ

اے میرے اللہ میں نے روزہ رکھا، تیرے لئے اور ایمان لایا، تجھ پر اور بھروسہ کیا، تجھ پر اور افطار کیا، تیرے رزق پر۔

بندے کا اس طریق سے خدا کا شکر ادا کرنا اور اس کی فرمانبرداری کا یہ انداز کتنا حسین ہے جس میں بندے اور خدا کے درمیان قریبی تعلق کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کے اس تشکر اور فرمانبرداری کو ان الفاظ میں شرف قبولیت عطا فرماتا ہے۔

جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ رسول اکرم صلعم کے ذریعہ فرماتا ہے اَلصَّوْمُ لِیْ وَ اَنَا اَجْزِیْ بِهٖ یعنی اگر حقیقی معنوی میں اے بندے تو نے صرف اور صرف میری خاطر روزہ رکھا ہے تو پھر میں خود ضرور بالضرور تجھ کو اس کا اجر دوں گا۔

اس بات کو قرآن مجید میں پھر اللہ تعالیٰ اپنے شاہانہ انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں:

اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ الْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ

اور جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو میں قریب ہوں میں دعا کرنے والے کی دعا کو جب وہ پکارتا ہے قبول کرتا ہوں۔

لیکن قرب الٰہی اور قبولیت دعا کے لئے اللہ تعالیٰ نے آگے اسی آیت میں ایک شرط کا ذکر بھی کر دیا کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ "وہ میری فرمانبرداری کریں اور مجھ پر کامل ایمان لائیں"۔

روزہ کے احکامات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ دو اور امور کا بھی بطور خاص ذکر فرماتا ہے ایک عورتوں کی عزت و تکریم اور دوسرے لوگوں

کے مال کو ناجائز طریقہ پر نہ کھانا۔ میرے نزدیک یہ دو امور ضبط نفس کے سلسلہ میں ہمیشہ سے بڑے اہم رہے ہیں اور آج تو سماجی برائیوں میں یہ سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہیں۔

ان برائیوں سے پیدا شدہ معاشی اور معاشرتی مسائل مسلمان ممالک کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں اور اس سلسلہ میں ہماری کوتاہیاں ہم کو مغربی استعمار کی غلامی میں پھنساتے چلے جا رہے ہیں۔ تمام تر افرادی اور مادی قوت اور وسائل کے ہونے کے باوجود مسلمان حکومتیں مغربی طاقتوں کے دست نگر ہیں اور سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ من حیث القوم انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم میں یہ شعور ہی بیدار نہیں ہو رہا کہ ہم گراوٹ کی کس اتھاہ گہرائی کی طرف گرتے چلے جا رہے ہیں۔

قرآن مجید میں حسن معاشرت میں جہاں خوش خلقی، ہمدردی اور بھلائی کے طور طریق کے لئے احکامات آئے ہیں وہاں سماج میں فلاح و بہبود کو نشو و نما دینے کے لئے جنسی بے راہروی کو روکنا اور عورت کی عزت و تکریم کو قائم کرنے کی تاکید بھی کی گئی ہے۔ سورہ بقرہ میں روزوں کے احکامات کے سلسلہ میں ان آیات میں اسی بارے میں الفاظ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۱۸۷) یعنی عورتیں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ میں اسی کی طرف خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ میاں بیوی سماج کی ایک اہم اکائی ہیں جو باہم اشتراک سے گھریلو زندگی کی تعمیر کرتے اور اسے خوشگوار ماحول فراہم کرتے ہیں اس میں کسی کو دوسرے پر فوقیت کے عنصر کو لانا گھریلو ماحول کو غیر متوازن کر دیتا ہے۔ عورت کو مرد کا لباس ٹھہرا کر اللہ تعالیٰ نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں مرد کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ جس طرح لباس نہ صرف جسم کے ننگ کو ڈھانپتا ہے بلکہ اس کے نقائص کو چھپاتا اور اس کے ظاہری حسن اور دلکشی کو بڑھاتا ہے اسی طرح عورت مرد کے لئے ذہنی اور جسمانی سکون فراہم کرتی ہے۔ اور میرا گھر میری جنت کو حقیقت کا روپ دیتی ہے۔ اس کے لئے قرآن مجید نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا (۳۰:۲۱) یعنی کہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ۔ پھر عورت گھر اور گھریلو زیبائش و آسائش اور بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں جس صبر و تحمل، ایثار اور بردباری کا مظاہرہ کرتی ہے اس کے لئے بھی قرآن مجید نے لفظ "لباس" ہی استعمال کیا ہے۔ جدید اصطلاح میں میں اگر اس کے کردار کو کسی جامع لفظ سے بیان کرنے کی کوشش کروں تو اس کو میں InteriorDecorator کا نام دینا چاہوں گا۔

لوگوں کے حقوق کا خیال اور ان کے مال کی حفاظت بھی روزوں کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ جن کی طرف بھی خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ اس برائی نے ملک میں سماجی ناہمواری اور سیاسی افراتفری کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم نے اس مبارک مہینہ میں جن دینی اور سماجی فرائض کو پورا کرنے کی تربیت حاصل کی ہے سال کے باقی دنوں میں ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہمیں یہ توفیق بھی عطا فرمائے کہ ہم خوش خلقی، ہمدردی، شفقت، صبر و تحمل اور اخلاص کی خصوصیات کو پہلے سے بڑھ کر اپنی زندگی کا معمول بنا سکیں۔ اللہ تعالیٰ سے یہ بھی التجا ہے کہ وہ ہم پر، ہمارے اہل و عیال پر، دوست اور احباب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔ ان کو صحت، علم اور فراوانی سے نوازے اور اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

میری طرف سے اور مرکزی انجمن کی طرف سے آپ سب خواتین و حضرات اور بچوں کو عید کی بھرپور خوشیاں مبارک ہوں۔ اللہ تعالیٰ نئی صدی میں مسلمانوں پر رحم فرمائے اور ان کو دشمنوں کے خطرناک عزائم سے محفوظ رکھے اور آپس میں بھائی چارہ کو فروغ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

دعا کی حقیقت اور تاثیر

ماخوذ از ماہوار بلیٹن، احمدیہ انجمن اشاعت اسلام، لاہور (برلن، جرمنی) نومبر ۱۹۹۹ء

لفظ دعا جو کہ اس مضمون کے عنوان میں استعمال کیا گیا ہے اس کا مطلب مبہم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں لفظ دعا میں نماز کو شامل نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ سب سے بڑی دعا نماز خود ہے۔ نماز کا اصل نام تو صلوٰۃ ہے دعا اور نماز یا صلوٰۃ کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس وقت جب کہ نماز طالب (یعنی انسان) اور مطلوب (یعنی خدا) کے درمیان ایک ایسا رنگ اختیار کرلے کہ نماز پڑھتے وقت انسان خدا کے علاوہ دوسری ہر چیز کو بھول جائے اور اس کے سامنے صرف خدا ہی خدا ہو تو پھر اللہ تعالیٰ اور ایسے انسان کے درمیان ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ جب یہ رشتہ قائم ہو جائے تو پھر ہی خدا اپنے ایسے بندے کی زیادہ تر دعائیں قبول فرماتا ہے۔

اگر آپ کو یہ تعلق پیدا کرنا ہے تو پھر آپ کو اپنی نماز اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھنے سے بہت پہلے شروع کرنی ہوگی۔ آپ کی نماز اسی وقت شروع ہو جائے گی جس وقت آپ کے کان میں اذان کی آواز آئے گی۔ صبح سویرے جب آپ کو یہ آواز آئے تو آپ کے ذہن میں فوراً یہ خیال آئے کہ خدا تعالیٰ کی معیت کسی دوسرے کی معیت سے یا بستر کے آرام سے بہتر ہے۔ جب دوپہر کو یہی آواز آئے تو آپ کا دل فوراً کہے کہ اللہ تعالیٰ کی جستجو کسی بھی مادی چیز کی جستجو سے بہتر ہیں ہے اور آپ دنیاوی فائدوں کی امید چھوڑ کر روحانی ترقی کی طرف چل دیں۔ عصر اور مغرب کے وقت بھی اذان سن کر آپ کا دل یہی کہے۔ یہاں تک کہ رات کو جب آپ تھک ہار کر گھر پہنچیں تو آپ کو راحت اور آرام، ٹی وی اور بیوی بچوں کی صحبت میں نہیں بلکہ خدا کی صحبت میں ملے۔ صبح سے شام تک آپ کو یاد دہانی کروائی جاتی ہے کہ اشھدان لا الہ الا اللہ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ کوئی بھی چیز ماسوا اللہ تعالیٰ مقصود زندگی نہیں ہونی چاہئے۔ اور مزید یہ کہ اشھدان محمد رسول اللہ یعنی دیکھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنی تمناؤں کا محور بنایا اور دین اور دنیا دونوں میں کتنی عظیم الشان کامیابیاں حاصل کیں اور آپ کو اس بات کی یاد دہانی بھی کروائی جاتی ہے کہ دنیا کے دھندے چھوڑ دو اس لئے کہ جس چیز کی طرف تمہیں بلایا جا رہا ہے اس میں ہی اصل فائدہ ہے۔

اذان آپ کے دل پر جو اثر کرتی ہے وہ اس چیز کا معیار ہے کہ اللہ تعالیٰ اور آپ کے درمیان کیا تعلق ہے۔ یہ اس تعلق کو قائم کرنے کی طرف پہلا قدم ہے۔ ہمارے بیوی بچے ہمیں آواز دیں تو ہم سارے کام چھوڑ کر بھاگتے ہیں اور جب تک ہم ان کے پاس پہنچ نہ جائیں ہمیں بے چینی لگی رہتی ہے۔ تو کیا مؤذن کی آواز کو آپ کے دل میں اس سے بڑھ کر بے چینی نہیں پیدا کرنی چاہئے! خدا تعالیٰ آپ کو بلا رہا ہے اور آپ دنیا کے کاموں میں ایسے مصروف و مشغول ہیں کہ کوئی پرواہ ہی نہیں۔ جیسا کہ نماز کوئی بڑا معمولی اور غیر اہم سا کام ہے جو کبھی وقت ہوا تو ہو جائے گا!

اذان کے بعد وضو آتا ہے۔ وضو کا مقصد یہ نہیں کہ آپ بھاگتے آئیں اور پانی کے چند چھینٹے منہ پر ڈال کر ہاتھ باندھ لیں۔ وضو ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی طہارت ہے۔ جب آپ منہ کے اندر پانی ڈالتے ہیں تو ایک لمحے کے لئے ذرا سوچیں کہ کیا آپ نے اس زبان سے کوئی گناہ کیا ہے۔ کوئی جھوٹ بولا ہے، کسی کی غیبت کی ہے، کسی کو بے ایمانی پر ابھارا ہے۔ چہرے پر پانی ڈالیں تو سوچیں کہ کیا آپ کی آنکھوں نے کسی پر بری نظر ڈالی ہے، کیا آپ نے ان آنکھوں سے کوئی ایسی چیز دیکھنے کی کوشش کی ہے جو مناسب نہ تھی۔ کیا آپ نے کوئی ظلم ہوتے دیکھا اور دیکھ کر کیا آپ نے اس ظلم کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی یا نہیں۔

اسی طرح اپنے کانوں کا محاسبہ کریں۔ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کا محاسبہ کریں۔ کیا آپ کے ہاتھوں نے کوئی ظلم کیا؟ کیا آپ کے پاؤں آپ کو کسی ایسی جگہ لے گئے جہاں گناہ ہو رہا تھا۔ یہ محاسبہ کرتے کرتے جب آپ کی فطرت اللہ تعالیٰ کے احکام کی غلام ہو جائے تو پھر اس سے آپ کا تعلق خدا تعالیٰ سے قائم ہو گا۔ خدا تعالیٰ تو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے۔ لیکن ہمیں وہ ڈھونڈے کیوں نہیں ملتا؟ کہیں ہم اندھے اور بہرے تو نہیں ہو گئے کہ وہ ہمارے سامنے ہے لیکن ہمیں نظر نہیں آتا۔ وہ ہمیں آوازیں دیتا ہے لیکن ہمیں سنائی نہیں دیتا۔ اذان کا مقصد ہمارے ذہنوں سے مادی خیالات نکال کر ہمارے خیالات کو خدا تعالیٰ کی طرف لگانا ہے۔ وضو کا مقصد ہمارے جسموں سے دنیاوی گندگی دھونا ہے۔ کیا خوب فرمایا رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کیا کوئی شخص جو دریا کے کنارے رہے اور ہر روز پانچ مرتبہ اچھی طرح نہائے گندا رہ سکتا ہے۔ اسی طرح باطنی اور روحانی طہارت کے بعد، خدا کے ہو کر آپ نماز کے قابل ہوتے ہیں اور پھر نماز میں آپ اپنے دوست کے سامنے اپنی خطاؤں کا اقرار کرتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ آپ دوبارہ یہ غلطیاں نہیں کریں گے۔

حضرت مسیح موعودؑ سے پوچھا گیا کہ انسان کو کس طرح پتہ چلے کہ اس کی نماز واقعی خدا کے لئے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جس طرح ایک نشہ کرنے والا نشے کے بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح جب تم نماز کے بغیر نہ رہ سکو تو پھر تمہاری نماز خدا کو

پانے کے لئے ہے اور جب تم اللہ تعالیٰ کی معیت کے بغیر رہ نہ سکو تو پھر تم خدا کے ولی اور دوست بن جاؤ گے۔ اس کے بعد نہ تمہیں غم چھوئے گا اور نہ ہی ڈر۔ اللہ تعالیٰ تو سب ہی کی آواز سنتا ہے لیکن وہ اپنے دوست کی آواز زیادہ سنتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی ہر دعا قبول ہو جاتی ہے۔ جب دعا قبول نہ ہو تو چند چیزیں یاد رکھیں۔

پہلی بات تو یہ کہ صلوٰۃ کا مقصد آپ کے دل میں ایک ایسی تبدیلی پیدا کرنا ہے کہ آپ ہر چیز میں خدا تعالیٰ پر انحصار کریں اور دنیا کی مصلحتیں آپ پر اثر انداز نہ ہوں۔ خدا پر سچ انحصار کرنے سے انسان غم و حزن اور خوف سے نجات پالیتا ہے۔ حضرت مرزا صاحب کا ایک مشہور و معروف واقعہ ہے۔ آپ ایک پمفلٹ ڈاک سے بھیجنے کے لئے لفافوں میں ڈال رہے تھے۔ ڈالتے ڈالتے ایک مخالف کا نام آگیا۔ اس کے نام لفافے میں پمفلٹ ڈالتے ہوئے حضرت مرزا صاحب کے ذہن میں ایک اور نکتہ آگیا۔ آپ نے اسی وقت وہ کاغذ پر لکھ کر پمفلٹ کے ساتھ وہ کاغذ بھی پیکٹ میں ڈال دیا۔ پمفلٹ سستی ڈاک سے جانے تھے لیکن یہ لفافہ بھی دوسرے لفافوں کے ساتھ مل گیا اور سہواً سستی ڈاک سے چلا گیا۔ مخالف نے خط ملتے ہی پولیس میں رپورٹ درج کروا دی کہ مرزا غلام احمد نے سستی ڈاک کی سہولت استعمال کر کے ایک ذاتی خط بھیجا ہے۔ ڈاک خانے والوں نے حضرت مرزا صاحب پر مقدمہ بنا دیا اور جرم ثابت ہونے کی سزا جیل میں قید تھی۔ وکیلوں کا کہنا تھا کہ شکایت کرنے والا حضرت مرزا صاحب کے مشہور مخالفین میں سے تھا اس لئے اگر حضرت صاحب عدالت میں یہ کہہ دیں کہ انہوں نے خط لفافے میں نہیں ڈالا تو کوئی عدالت بھی انہیں سزا نہ دے گی۔ حضرت مسیح موعود نے صاف عدالت کے سامنے جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ایک وکیل نے کہا کہ اگر آپ کو سزا ہو گئی تو دنیا لعن طعن کرے گی۔ جواب میں حضرت مرزا صاحب نے جو فرمایا وہ سنہرے حروف میں لکھا جانا چاہئے۔ آپ نے فرمایا "تو کیا دنیا کی لعنتوں سے ڈر کر میں خدا کی لعنت اپنے اوپر لے لوں۔ اگر سچ بولنے کی وجہ سے لوگ مجھے چھوڑ جائیں گے تو چھوڑ دیں، میرا محافظ میرا خدا ہے ان کے بدلے وہ مجھے ایک ایسی جماعت دے گا جس کا ایمان اتنا کمزور نہ ہو گا" اور اس خدا نے اپنی ایسی قدرت دکھائی کہ عدالت نے حضرت مرزا صاحب کو باعزت بری کر دیا۔

دعا کی قبولیت یا نہ قبول ہونے کی مثال اس طرح لے لیں۔ اگر آپ بیمار ہوتے ہیں اور دوا سے آپ کو آرام نہیں آتا تو آپ کیا کرتے ہیں؟ کیا آپ دوا چھوڑ دیتے ہیں یا دوا کی خوراک زیادہ کر دیتے ہیں؟ اگر آپ کی دعائیں نہیں سنی جاتی تو اور زیادہ دعائیں مانگیں، شدت سے دعائیں مانگیں، لمبی لمبی دعائیں مانگیں۔ کوشش کریں کہ آپ کی نمازیں اور زیادہ سنوار کر پڑھی جائیں لیکن ہمت نہ ہاریں۔ اگر آپ کی دعا سنی نہیں بھی جاتی تو خدا تعالیٰ آپ کو جواب ضرور دے گا۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ ہمارا علم صرف ماضی اور حال کے حالات تک محدود ہے لیکن خدا تعالیٰ کو زمان و مکان میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ وہ جانتا ہے ہم نہیں جان سکتے۔ سو اگر ہمیں یہ محسوس بھی ہو کہ ہماری دعا سنی نہیں گئی تو ہمیں خدا تعالیٰ کی رضا پر رضامند ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ وہی جانتا ہے کہ ہماری بہتری کس بات میں ہے۔

اگر ہمیں خدا سے سچا پیار ہے تو اسکی کسی بھی بات پر ہمیں شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ ہمارے بیوی بچے، ہمارے رشتہ دار، وغیرہ ہماری مرضی کے خلاف کیا کچھ نہیں کرتے۔ کیا ہم انہیں چھوڑ دیتے ہیں یا صبر سے ان کی باتیں برداشت کرتے ہیں۔ تو کیا خدا تعالیٰ کے لئے ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے!

حضرت ایوبؑ نے ہمارے لئے کیا عظیم الشان مثال قائم کی۔ کہاوت ہے کہ خدا تعالیٰ نے شیطان کو کہا کہ ایوبؑ کو دیکھ لو میرا کیسا فرمانبردار بندہ ہے۔ تو شیطان نے کہا کیوں نہ ہو، اسے تو نے سب کچھ تو دے رکھا ہے۔ تو خدا نے فرمایا جا میں نے تجھے ایوبؑ کے اثر و رسوخ اور جاہ و جلال پر طاقت دی۔ شیطان نے ایسی چال چلی کہ حضرت ایوبؑ کا اثر و رسوخ جاتا رہا۔ خدا تعالیٰ نے پھر شیطان کو کہا کہ ایوبؑ کو دیکھ وہ میرا کیسا فرمانبردار بندہ ہے۔ تو شیطان نے کہا کیوں نہ ہو، اب بھی اس کے پاس دولت تو ہے۔ تو خدا تعالیٰ نے کہا جا میں نے تجھے ایوبؑ کی دولت پر طاقت دی اور حضرت ایوبؑ کی ساری دولت جاتی رہی۔ کرتے کرتے حضرت ایوبؑ سب کچھ کھو بیٹھے۔ نہ شان و شوکت رہی، نہ دولت، نہ صحت، نہ دوست واحباب۔ ایک دن جب حضرت ایوبؑ شدید تکلیف میں تھے تو آپ کی اہلیہ رو پڑیں اور درخواست کی کہ دعا کریں کہ یہ تکلیفیں دور ہو جائیں۔ یہ سن کر حضرت ایوبؑ غصہ میں آگئے اور فرمایا کہ عورت تو مجھے چھوڑ کر چلی کیوں نہیں جاتی۔ بیوی بولی کہ میں تو آپ کی بیوی ہوں میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ حضرت ایوبؑ نے فرمایا کہ جتنا صدق و وفا تم نے دکھایا ہے اور جس طرح تم نے بلا شکایت میری خدمت کی ہے کیا خدا کا میرے پر اتنا حق بھی نہیں۔ وہ میرا مولیٰ ہے اس کا حق ہے جو چاہے کرے۔ لیکن بندگی کا تقاضا ہے کہ میرے منہ سے اف تک نہ نکلے۔ خدا تعالیٰ نے پھر شیطان کو کہا ایوبؑ کو دیکھ وہ میرا کیسا فرمانبردار بندہ ہے اور شیطان لاجواب ہو گیا۔

یہ وہ بلندی ہے جہاں ہمیں پہنچنا ہے اور جہاں پہنچنے والوں کو وہ اپنے ولی کہتا ہے اور ان کی مرادیں پوری کرتا ہے۔ سو عزیزو دعا کرو کہ خدا تعالیٰ ہمیں ہمت اور طاقت دے کہ ہم دنیا کو چھوڑ کر صرف اس کے ہو جائیں۔ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ راضی بہ رضا رہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی آزمائش آئے وہ اس کو اپنے محبوب کا تحفہ سمجھ کر خوشی سے قبول کرلے اور شکایت کا لفظ زبان پر نہ لائے اور جس طرح حضرت ایوبؑ نے صبر کی وہ مثال قائم کی کہ ان کا نام اور صبر ایوبی ایک مثال بن گیا ہر مسلمان بھی اپنے کردار سے صدق و وفا اور صبر اور شکر کا نمونہ بن کر دکھائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں نہ کسی چیز کا غم ہوتا ہے اور نہ ہی وہ دنیا کی لالچ میں صراط مستقیم سے ہٹ جاتے ہیں۔ سو دوستو! آؤ مل کر دعا کریں کہ خدا تعالیٰ ہمیں طاقت دے کہ ہم بھی صبر ایوبی کا مظاہرہ کریں اور خدا کے مقبولوں میں شامل ہو جائیں۔

اخبار کا تراشہ

اکیسویں صدی کا جہاد قرآنِ حکیم کے ذریعہ

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

ماخوذ از مجلہ "البلاغ" جنوری ۲۰۰۰ء۔ ممبئی، بھارت

آج دنیا میں ہر طرف سماجی اور تہذیبی برائیوں، لسانی اور قومی جھگڑے فسادات اور تمدنی و سیاسی فتنوں کا دور دورہ نظر آ رہا ہے اور ان ساری خرابیوں اور فتنہ انگیزیوں نے مل کر عالم انسانی کا چین و سکون غارت کر دیا ہے اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اب بڑی طاقتوں کی جہانگیری اور ان کے خطرناک فوجی و سیاسی عزائم نے ساری دنیا کے امن و امان کے لئے ایک سنگین خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے آج پورا عالم انسانی بارود کے ایک ڈھیر پر بیٹھا ہوا ہے۔ لہٰذا اگر ان الحادی فتنوں کو ختم کرنے کی تدبیر نہ کی گئی تو پتہ نہیں کہ یہ دنیا کب بھک سے اڑ جائے۔

جہاد کے بارے میں بعض غلط فہمیاں

لیکن سوال یہ ہے کہ ان فتنہ انگیزیوں کا مقابلہ کون کرے گا اور کس طرح کرے گا؟ اس وقت دنیا میں ایسا کوئی مذہب یا نظام موجود نہیں ہے جو نظریاتی اور عملی میدانوں میں ان خطرناک رجحانات کا خاتمہ کر کے انسانیت کو امن و امان اور چین و سکون عطا کر سکتا ہو۔ ہاں البتہ اسلام ہی ایک واحد مذہب اور واحد نظام ہے جو ان تمام فتنوں کا استیصال اور معاشرتی و تمدنی ظلم و ستم کا خاتمہ کر کے نوعِ انسانی کو راحت پہنچا سکتا ہے اور الحاد و لادینیت کو جڑ سے اکھاڑ کر خدا پرستی کا احیاء کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اس مقصد کے لئے "جہاد" کی شکل تجویز کی ہے۔ مگر آج خود مسلمان جہاد کی حقیقت و اہمیت سے نابلد ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اسلام میں جہاد کی نوعیت کا مطالعہ کیا جائے تاکہ اس کی صحیح تصویر سامنے آ سکے اور جب اس کی اصل تصویر سامنے آئے گی تو ہر شخص اس کی ضرورت و اہمیت کا قائل ہو جائے گا اور غلط فہمیوں کے بادل چھٹ جائیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ جہاد کے بارے میں غیر تو غیر خود اپنوں کے درمیان بھی بہت سے شبہات پائے جاتے ہیں، جو اسلامی تعلیمات سے دوری یا لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ بلکہ بہت سے لوگ تو محض جہاد کا نام ہی سن کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں اور اس کے نام ہی سے ایک مہیب اور ہیبت ناک شکل ذہن میں آتی ہے۔ کیونکہ عمومی طور پر "جہاد" کو "تلوار اٹھانے" اور "خون بہانے" کے مترادف تصور کر لیا گیا ہے اور اس سلسلے میں مخالفین اسلام اور خاص کر مستشرقین نے اسلام کی تصویر بگاڑ کر پیش کی ہے اور مشہور کر دیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ اسی بناء پر آج اسلام کو ایک "جنگجو" مذہب قرار دیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا بے بنیاد پروپیگنڈہ اسلامی نظام حیات سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔

اسلام میں جہاد کی حقیقت

جہاد کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ دین کی راہ میں جدوجہد کرنے کا نام ہے۔ چنانچہ لفظ "جہاد" کے لغوی معنی ہیں: "کسی چیز کی مدافعت میں اپنی وسعت و طاقت صرف کرنا" (معجم الفاظ القرآن)۔

جہاد کے دو بازو ہیں۔ اس کا ایک بازو ہے اسلام کی پرامن تبلیغ اور دلیل و استدلال کے ذریعہ اسلامی نظام حیات کی خوبیاں بیان کر کے لوگوں کو دین کی طرف بلانا اور اس کا دوسرا بازو ہے جب اسلامی معاشرے کو اندرونی یا بیرونی "خطرات" کا سامنا ہو تو دین کی مدافعت کی غرض سے فتنہ و فساد کی روک تھام بذریعہ قوت کرنا تاکہ اس کے نتیجے میں معاشرتی و تمدنی نقطۂ نظر سے امن و امان قائم ہو۔ اس لحاظ سے جہاد کے دو مصداق ہوئے۔ ایک پرامن تبلیغ اور دوسرے فتنہ و فساد کی روک تھام یا "مدافعانہ جنگ"۔ اور اہلِ اسلام کو حکم ہے کہ وہ جہاد کی پہلی شکل کو ہر حال میں جاری رکھیں تاکہ دنیا اسلامی نظام حیات کی خوبیوں کا نظارہ کر کے اس کی آغوش میں آ سکے۔ یہی اصل جہاد ہے۔ جو مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا ہے۔

اس اعتبار سے جہاد کے اصل معنی و مفہوم میں ہتھیار اٹھانا یا خون بہانا شامل نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت ثانوی یا دوسرے نمبر پر ہے، جب کہ اسلام اور اہلِ اسلام کو خطرہ لاحق ہو جائے اور وہ بیرونی طاقتوں کے نرغے

میں آجائیں۔ تب وہ اپنی مدافعت میں ہتھیار اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں اہلِ اسلام کو حکم ہے کہ اس حالت میں بھی وہ اپنے دشمن پر زیادتی نہ کریں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "تم اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر اس معاملے میں زیادتی نہ کرو۔ کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا" (بقرہ ۲:۱۹۰)۔

سماجی برائیوں کے خلاف جہاد

فتنہ و فساد کی دو قسمیں ہیں (۱) سماجی فتنے یا اخلاقی برائیاں اور ایک دوسرے کے حقوق کی پامالی وغیرہ۔ (۲) سیاسی و فوجی خطرات جو بیرونی قوتوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث لاحق ہو سکتے ہوں۔ چنانچہ اندرونی و بیرونی دونوں قسم کے فتنوں کا سدباب کر کے اسلامی معاشرے کو مضبوط بنانا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ جو قوم اخلاقی و سماجی برائیوں میں مبتلا ہو جائے وہ بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتی اور جب تک بیرونی قوتوں کا مقابلہ نہ کیا جائے اسلامی معاشرے کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ لہٰذا یہ دو طرفہ جنگ جیتنے کے لئے مسلم قوموں کو اندرونی برائیوں اور جھگڑوں کو بھی مٹا کر معاشرے میں ہر طرح سے امن و امان قائم کرنا ضروری ہے۔

اس لحاظ سے جہاد کا تعلق معاشرتی برائیوں اور باہمی ظلم و جور سے بھی بہت گہرا ہے۔ اسی وجہ سے ایک حدیث میں سماجی برائیوں (منکرات) کو روکنا ہر مسلمان کا ایک قومی و شرعی فریضہ قرار دیا گیا ہے (مسلم)۔ اور جہاں پر اسلامی حکومت قائم ہو اس کے خصوصی فرائض میں "معروف" کی ترویج و اشاعت اور "منکرات" کی روک تھام بھی ہے (حج ۲۲:۴۱)۔

جہاد کے مقاصد

یہ ہے جہاد کی حقیقت و ماہیت۔ اب جہاں تک جہاد کے مقاصد کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں حافظ ابن حجرؒ نے اس کی توجیہہ اس طرح کی ہے "جہاد دین کی نشر و اشاعت اور کفر (کے چراغ) کو گل کر دینے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے" (فتح الباری: ۶/۵)۔ علامہ ابن ہمامؒ نے مقصد جہاد کی جو تشریح کی ہے وہ یہ ہے "جہاد در اصل اللہ کی بات کو اونچا کرنے کی غرض سے دنیا سے فتنہ و فساد کو دور کرنا ہے" (فتح القدیر: ۵/۱۱۷)۔ اور اس سلسلے میں امام کاسانیؒ تحریر کرتے ہیں کہ جہاد فرض قرار دینے کا مقصد اسلام کی دعوت دین، حق کا غلبہ، کافروں کے شر سے بچاؤ اور انہیں مغلوب کرنا ہے (بدائع الصنائع: ۷/۹۷)۔

اس لحاظ سے جہاد کسی قوم یا ملک کے خلاف کوئی "جارحانہ" کارروائی یا بلاوجہ "خوں ریزی" کرنا نہیں، بلکہ "معروف" کی اشاعت اور "منکرات" کی روک تھام کر کے مخلوق خدا کو راحت پہنچانا ہے۔ کیونکہ پوری دنیا اللہ کا کنبہ ہے، جسے شر و فساد سے پاک کرنا ضروری ہے اور اس اعتبار سے جہاد کا "نشانہ" اقوام یا افراد نہیں بلکہ "کفر و الحاد" اور ان کی فتنہ انگیزیاں ہیں، جو اقوام عالم کے عادات و اطوار بگاڑ کر انہیں نرا حیوان بنا دینا چاہتی ہیں اور ان بے خدا نظاموں نے آج پوری دنیا کو ایک جہنم کدہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ لہٰذا ان فتنوں کے خلاف سینہ سپر ہو جانا موجودہ دور کا سب سے بڑا جہاد ہے۔

موجودہ دور کے یہ سماجی و تمدنی فتنے چونکہ الحاد و لادینیت یا بے خدا تہذیب کا لازمی نتیجہ ہیں، لہٰذا ان الحادی فتنوں کے خاتمے کے لئے سب سے پہلے فکری و نظریاتی حیثیت سے ان الحادی نظریات اور ان کے نظاموں پر تیشہ چلانا ضروری ہے۔ ورنہ ان کا زور ٹوٹ نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ ڈالیوں کو چھانٹ دینے سے ہی دوبارہ شاخیں پھوٹتی ہیں۔ لہٰذا ان نظاموں کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے اور اس مقصد کے لئے عقلی دلائل کی بنیاد پر ایک جوابی فلسفہ تیار کر کے ان الحادی نظاموں کا خاتمہ کرنا اور علمی میدان میں انہیں شکست دینا ضروری ہے۔

مسلمان جہاد کس طرح کریں؟

موجودہ الحاد و لادینیت اور بے خدا تہذیبی فتنوں کے خلاف جہاد کس طرح کیا جائے؟ اور مختلف قوموں کے جبر و استحصال اور ظلم و جور کا مقابلہ کیسے ہو؟ تو یہ بہت اہم سوالات ہیں اور ان کا جواب بھی قرآن اور حدیث کے ابدی احکام میں موجود ہے۔ چنانچہ اس راہ میں کام کرنے کی دو نوعیتیں ہیں: پہلی یہ کہ سماجی اور تمدنی برائیوں کا استیصال اور دوسرے فکر و فلسفہ یا عقائد کی دنیا میں شر و فساد کا خاتمہ، تاکہ "پورا دین اللہ کا ہو جائے"۔

اس لحاظ سے جہاں تک سماجی برائیوں اور تمدنی رخنوں کا تعلق ہے تو ایک مشہور حدیث ہے کہ تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے مٹا دے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو پھر زبان سے اس کی مذمت کرے۔ یہ خطاب افراد امت سے بھی ہے اور مسلم حکومتوں سے بھی ہو سکتا ہے چنانچہ ان دو زرین اصولوں کے مطابق کسی برائی کو روکنے کے لئے پہلے نمبر پر "قوت" کی ضرورت ہے۔ اگر مسلمان اتنی قوت رکھتے ہوں تو وہ ایسا ضرور کر سکتے ہیں اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو پھر زبان یا قلم کے

ذریعہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر انسانی و اخلاقی اقدار کی بحالی کے لئے علم جہاد بلند کرسکتے ہیں چنانچہ آج لٹریچر اور میڈیا کا زمانہ ہے۔ اس لئے اس میدان میں آج مسلمانوں کو "لٹریری جہاد" کی تیاری کرنی چاہئے اور یہ مسلمانوں کا ایک دینی و شرعی فریضہ ہے، جسے کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

قرآنی ہدایت اور اس کے دلائل

اب جہاں تک فکری و اعتقادی شر و فساد کو ختم کرنے کا تعلق ہے تو وہ پر امن تبلیغ کے ذریعہ اسلامی نظام حیات برپا کرنا اور اللہ کے احکام کو بندوں پر نافذ کرنا ہے اور اس راہ میں کسی پر ظلم و زیادتی کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں ہے" (بقرہ ۲:۲۵۶)

یہ دعوتی جہاد ہے جسے حدیث نبوی میں "قولی جہاد" کہا گیا ہے اور اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ یہ دعوتی یا قولی جہاد چونکہ اسلام کا دائرہ بڑھانے کی غرض سے ہے تاکہ اس کے ذریعہ کفر والحاد کا خاتمہ ہوسکے۔ اس لئے اس کا انداز نوع انسانی کو متاثر کرنے والا ہونا چاہئے۔ کیونکہ پوری نوع انسانی اسلام کی نظر میں "امت دعوت" ہے اور مسلمان شرعاً پوری نوع انسانی کے لئے داعی بنا کر بھیجے گئے ہیں اور اسلام کا پیغام بھی دنیا کے تمام انسانوں کے لئے ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد باری ہے: "کہہ دو کہ اے لوگو میں تم سب کے لئے اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں" (اعراف ۷:۱۵۸)۔

اس لحاظ سے نوع انسانی کو اسلام کی خوبیوں، اس کے عقلی محاسن اور اس کے علمی دلائل کے ذریعہ متاثر کرنا ہے، کیونکہ مجرد وعظ و نصیحت موجودہ دور کے لئے کارگر نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے قرآن عظیم کو ہر قسم کے علمی و عقلی دلائل سے مزین کر دیا گیا ہے تاکہ وہ نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کا باعث بن سکے۔ جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے: "یہ قرآن (دنیا کے) تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے اس میں ہدایت کے واضح دلائل موجود ہیں اور وہ حق و باطل میں تمیز کرنے والا ہے" (بقرہ ۲:۱۸۵)۔

اس آیت کریمہ کی رو سے قرآن کی اصل ہدایت اس کے علمی دلائل و براہین ہیں جو نوع انسانی کو راہ راست پر لانے کی غرض سے ہیں۔ لہٰذا ان دلائل کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وہ دلائل ہیں جو حق و باطل میں تمیز کرتے ہوئے دنیائے انسانیت کو نئی روشنی دکھانے والے ہیں۔ لہٰذا ان دلائل کو منظر عام پر لانا اور عالم انسانی کے لئے ہدایت کا سامان بہم پہنچانا حاملین قرآن کی ذمہ داری ہے۔

سب سے بڑا جہاد قرآن کے ذریعہ

بہرحال حاملین قرآن کو کتابِ الٰہی میں مذکور انہی تمام علمی و عقلی دلائل کے ذریعہ اسلام کی دعوت دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خالق عالم ہونے کی حیثیت سے قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کی "عقلیت" اور "ذہنیت" سے بخوبی واقف ہے، اس لئے اس نے اپنی کتابِ حکمت میں ہر دور کی "ضرورت" کے مطابق ہر قسم کے دلائل و براہین رکھ دیئے ہیں جن کے ذریعہ عالم انسانی کے غلط افکار و نظریات اور اس کے بے بنیاد فلسفوں کا توڑ ہوسکتا ہو۔ اب یہ حاملین قرآن یا علمائے اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس صحیفہ حکمت میں غور و خوض کرکے ہر دور کی ذہنیت کے مطابق ان دلائل کو منظر عام پر لائیں اور یہ حاملین قرآن کے ذمہ ایک شرعی فریضہ ہے اور اسی طریقہ دعوت کو قرآن عظیم میں "بڑا جہاد" کہا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے (لیکن ہم نے ایسا کرنے کے بجائے ایک جامع کتاب بھیج دی ہے جو تمام بستیوں کی ہدایت کے لئے کافی ہے) لہٰذا تو منکرین خدا کی بات مت مان، بلکہ قرآن کے ذریعہ بہت بڑا جہاد کر" (فرقان ۲۵:۵۲-۵۳)۔

جس سورہ میں یہ آیات مذکور ہیں اس کا نام ہی "فرقان" ہے، یعنی حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب اور اس سورہ کی ابتدا اس طرح کی گئی ہے۔ "بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندہ پر فرقان (حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب) نازل کردی، تاکہ وہ سارے جہاں کو متنبہ کرسکے" (فرقان ۲۵:۱)۔

ان آیات کے ذریعہ صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ قرآن عظیم ایک عالمگیر صحیفہ ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کو بیدار کرنے کی غرض سے نازل کیا گیا ہے۔ اسی بنا پر اس میں ہر دور کے لحاظ سے دلائل ہدایت یا دلائل ربوبیت مذکور ہیں۔ انہی دلائل کے ذریعہ عالم انسانی راہ راست پر آسکتا ہے۔ لہٰذا ان خدائی دلائل کو اجاگر کرکے عالم انسانی کی ہدایت و رہنمائی کا سامان فراہم کرنا خود قرآن عظیم کی تصریح کے مطابق بہت بڑا جہاد یا سب سے بڑا جہاد ہے اور یہ فریضہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے دنیا کے تمام مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔

ان تصریحات سے بخوبی واضح ہوگیا کہ قرآن عظیم کیا ہے اور کس پایہ کی کتاب ہے۔ مگر اس کے باوجود اگر ہم نے اس صحیفہ حکمت میں غور و فکر کرکے نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کرنا چھوڑ دیا ہے تو اس میں قصور کس کا ہے قرآن عظیم تو سارے جہاں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے مگر حاملین قرآن اسے محض "کتاب تلاوت" سمجھ کر بے سوچے سمجھے اسے رٹنے اور اس کے "فضائل" بیان کرنے ہی میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ طرز عمل نہ صرف کتابِ الٰہی پر زیادتی ہے بلکہ اس طرز عمل کے ذریعہ نوع انسانی کی گمراہیوں میں مزید اضافہ کرنا بھی ہے اور اس کے ذمہ دار خود مسلمان ہیں۔

کتاب کا تعارف

قرآن سے قرآن تک

از علامہ محمد حسین عرشی

ناشر: دوست ایسوسی ایٹس، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ صفحات ۵۱۷، سن اشاعت ۱۹۸۸ء۔ قیمت۔/ ۳۲۰

(حضرت خواجہ احمد دین امرتسری ؒ نے قیام پاکستان سے کئی برس پہلے "بیان للناس" کے نام سے قرآن مجید کی ایک مبسوط تفسیر لکھی تھی۔ امت مسلمہ (ہند)، امرتسر نے سات جلدوں مین اسے شائع کیا تھا۔ یہ مبسوط تفسیر ایک عرصہ سے نایاب ہے۔ کاغذ اور طباعت کی ہوش ربا گرانی کی وجہ سے یہ ضخیم کتاب ایک مدت تک دوبارہ شائع نہ ہو سکی۔ علامہ محمد حسین عرشی کو خواجہ احمد دین صاحب امرتسری ؒ سے سالہا سال کسب فیض کا موقعہ ملا۔ چنانچہ اس ضخیم تفسیر کا خلاصہ انہی کی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے جو "قرآن سے قرآن" کی شکل میں شائع ہوئی اس کا پہلا ایڈیشن غالباً ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا اس وقت ہمارے پیش نظر ۱۹۹۸ء کا ایڈیشن ہے۔ بقول محمد اقبال سلمان، مدیر روزنامہ کوئٹہ اس "تلخیص کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ علامہ عرشی نے تقریباً تمام قدیم و جدید تفسیروں سے ایسے مطلب بھی حواشی کی شکل میں لے لئے ہیں جن سے خواجہ احمد الدین کی تشریح و تعبیر کی تائید نکلتی ہے" (تعارف ص ۵)

کتاب مذکورہ میں ولادت تا وفات مسیح ؑ کے موضوع پر "محمد علی اور مسیح ؑ" کے عنوان کے تحت حضرت مولانا محمد علی صاحب کی تفسیر "بیان القرآن" ایڈیشن اول (۱۹۲۲ء) سے اقتباس اور خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ جو قارئین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔ ایڈیٹر)

محمد علی اور مسیح ؑ

کفالت مریم

اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَھُمْ اَیُّھُمْ یَکْفُلُ مَرْیَمَ (آل عمران ۳:۴۳) جب وہ (ہیکل کے مجاور) اپنی قلمیں ڈالتے تھے کہ ان میں سے کون مریم کا کفیل بنے ...... (ترجمہ، محمد علی) ــــ اس مقام کی تفسیر میں محمد علی لکھتے ہیں "یہاں جس کفالت کا ذکر ہے اس سے مراد کفالت نکاح ہے۔ ایک سن بلوغ کو پہنچی ہوئی عورت کے لئے اب یہ ضروری تھا کہ اس کے نکاح کا فکر کیا جاتا اور مریم کی ماں نے مریم کو خدمت دین کے لئے نذر کر دینے کے بعد یہ دعا مانگ کر کہ اِنِّیْ اُعِیْذُھَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَھَا بتا دیا تھا کہ تارکہ بٹھانا اس کا منشاء ہرگز نہ تھا۔ اور نہ تارکہ بٹھانے کا بنی اسرائیل میں کوئی دستور معلوم ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ ہیکل کی خدمت کے لئے وقف ہو چکی تھیں۔ اس لئے ان کے والد یا والدہ کو ان کے نکاح کا اختیار نہ تھا۔ اس لئے عام رواج کے مطابق قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنا مناسب سمجھا گیا (ص ۳۰۸ ج اول "بیان القرآن")۔

ولادت مسیح

ولادت مسیح کے متعلق مولوی محمد علی لکھتے ہیں کہ

"معجزے کے لئے ضروری ہے کہ اس پر کسی کی شہادت ہو کوئی دیکھنے والا اس کا گواہ ہو مگر بغیر خاوند کے حمل ہونے کی گواہی سوائے مریم کے کوئی دوسرا دے ہی نہیں سکتا۔ یہ کرامت یا معجزہ کیا ہوگا؟...... جب تک اللہ تعالیٰ بالتصریح یہ نہ فرمائے کہ عیسیٰ ؑ کو ہم نے اپنے قانون کے خلاف یا الگ رنگ میں پیدا کیا تھا اس وقت تک یہی ماننا ہوگا کہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے وہ اسی رنگ کے تھے...... میرے نزدیک یہ نتیجہ (بے باپ پیدا ہونا) الفاظ قرآنی سے نہیں نکلتا۔

مس بشر

لَمْ یَمْسَسْنِیْ گزشتہ کا ذکر ہے کہ مجھے بشر نے نہیں چھوا، اس میں آئندہ کا کوئی ذکر نہیں...... یہ کہنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ انہیں ابھی علم بھی نہیں تھا کہ ان کا نکاح ہونے والا ہے۔

اناجیل سے ثابت ہے کہ حضرت مریم کے ساتھ یوسف کا تعلق زوجیت کا تھا۔ اسی تعلق سے آپ کے ہاں بہت سی اولاد بھی ہوئی" (ص ۳۱۴، ۳۱۵)

وَالَّتِیْ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا (انبیاء-۹۱) میں "احصان" کے معنی قید نکاح میں آتا ہے۔

شہادت حدیث

"حدیث ایک بھی ایسی نہیں ملتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا ہو کہ عیسیٰؑ بن باپ پیدا ہوئے۔ نجران کے وفد کے ساتھ گفتگو کے دوران میں آپ کے یہ صاف الفاظ مروی ہیں:

اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ عِیْسٰی حَمَلَتْہُ اَمْرَاۃٌ کَمَا تَحْمِلُ الْمَرْاۃُ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰؑ کو اس کی ماں نے حمل میں لیا جس طرح عورتیں بچوں کو حمل میں لیا کرتی ہیں۔

اور عورتیں بچوں کو اپنے خاوندوں سے ہی حمل میں لیتی ہیں..... جب عیسائیوں نے یہ سوال کیا کہ وَ قَالُوْالَہٗ مَنْ اَبُوْہُ؟ یعنی اس کا باپ کون ہے؟ تو آپؐ نے یہ جواب نہیں دیا کہ اس کا باپ کوئی نہیں، بلکہ جواب میں فرمایا اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّہٗ لاَ یَکُوْنُ وَ لَدٌ اِلاَّ وَ ھُوَ یُشْبِہُ اَبَاہُ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں۔ مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے یہ بتادیا کہ حضرت عیسیٰؑ کا باپ انسانوں سے ہی کوئی ہے۔ کیونکہ اس کی شکل انسانوں سے ملتی ہے۔ اگر بغیر باپ کے پیدا ہوتا تو یوں فرماتے کہ وہ آدم کی طرح بن باپ ہے یا کلمہ "کن" سے پیدا ہوا ہے......(ص۳۱۵)

مسیحؑ صرف بنی اسرائیل کے لئے

آیہ مبارکہ۔ رَسُوْلاً اِلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْل (آل عمران) کی تفسیر میں محمد علی صاحب لکھتے ہیں۔

"یہ آیت فیصلہ کرتی ہے کہ حضرت مسیحؑ امت محمدیہ کی اصلاح کے لئے نہیں آسکتے۔ نہ ہی دین اسلام کی توسیع تمام اقوام میں ان کا کام ہو سکتا ہے۔ اگر انہوں نے امت محمدیہ کے لئے بھی رسول ہونا ہوتا تو قرآن کریم میں یہ لفظ (رَسُوْلاً اِلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْل) جو ان کے کام کی حد بندی کرتے ہیں وارد نہ ہوتے۔ پس جس شخص پر یہ حکم لگ چکا ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کے لئے رسول ہوگا، اس کا ساری دنیا کی طرف رسول بننا محال ہے (ص۳۱۷)

سورہ مریم میں ولادت مسیحؑ

"خود مفسرین نے ایسے اقوال نقل کئے ہیں۔ جیسے وہب کا قول۔ اِنَّ مَرْیَمَ لَمَّا حَمَلَتْ کَانَ مَعَھَا ابْنُ عَمٍّ لَّھَا یُسَمّٰی یُوْسُفَ النَّجَّارَ ـــــ یعنی جب مریم کو حمل ہوا تو ان کے ساتھ ان کے چچا کا بیٹا یوسف نجار تھا۔ اور یہ یوسف نجار وہی ہیں جو بروئے اناجیل و تاریخ حضرت مریم کے شوہر تھے اور جن کے ساتھ مریم کا تعلق زوجیت..... خود عیسائیوں کو مسلم ہے......(ج:۲ ص۱۲۰۸)۔

مسیح آیۃ للناس

وَ لِنَجْعَلَہٗ آیَۃً لِّلنَّاسِ (مریم:۲۱) اور تاکہ ہم اس (مسیح) کو لوگوں کے لئے نشان اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔ ہر چیز جو بطور ایک دلیل نشان کے ہو آیتہ کہلاتی ہے۔ وَجَعَلْنَا الَّیْلَ وَالنَّھَارَ اٰیَتَیْنِ (بنی اسرائیل:۱۲) اور ہم نے دن اور رات کو دو آیتیں بنایا۔ حالانکہ دن رات معمولی طور پر آتے جاتے ہیں۔ ہر داعی حق کا وجود ایک آیت ہے۔ مخالفین حق کی ہلاکت بھی آیت ہے۔ یوسف اور برادران یوسفؑ کا معاملہ بھی آیت ہے۔ لَقَدْ کَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَ اِخْوَتِہٖ آیَاتٌ لِّلسَّائِلِیْنَ بلکہ کئی آیات ہیں......درحقیقت اللہ تعالیٰ کی سب مخلوق ہی نشان ہے وَکَاَیِّنْ مِنْ آیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (زمین و آسمان آیتوں ہی آیتوں سے بھرے ہوئے ہیں)۔ حضرت مسیحؑ کس معنی میں آیت تھے؟......ہو سکتا ہے کہ آیت میں ان کی رسالت کی طرف اشارہ ہو......اللہ کا نبی بلکہ صالح بندے بھی اس کے وجود پر آیت بن جاتے ہیں (ص۱۲۰۸)

مسیحؑ کی سواری

فَاَتَتْ بِہٖ قَوْمَھَا تَحْمِلُہٗ (مریم:۲۷) پھر وہ (مریم) اسے سوار کئے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی۔ تَحْمِلُہٗ سے مراد گود میں اٹھانا ہی نہیں بلکہ سواری دینا بھی ہے یا سوار کرنا (ص۱۲۱۱) اس کی سند میں سورہ توبہ کی آیت ۹۲ پیش کی ہے لِتَحْمِلَھُمْ تاکہ تو انہیں سواری دے (ص۸۷۲)

کلمۃ اللہ سے مراد

اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ (آل عمران ۳:۴۲) اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلام کے ساتھ خوش خبری دیتا ہے (ترجمہ، محمد علی)

اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلام کے ذریعہ بشارت دیتا ہے...... مسیح کو کلمۃ منہ کہا ہے یعنی اپنی طرف سے ایک کلمہ...... کلموں میں سے ایک کلمہ ہے لَوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمَاتُ رَبِّیْ (کہف ۱۸:۱۰۹) کہو اگر میرے رب کے کلمات کے لئے سمندر بھی سیاہی بن جائیں تو میرے رب کے کلمات اس قدر لاتعداد و لاتحصے ہیں کہ سمندر ختم ہو جائیں، مگر وہ کلمات ختم نہیں ہوں گے......(ص۳۰۹) خدا نے ایک بات کہی تھی، وہ مسیحؑ کے آنے سے پوری ہوگئی پس مسیح کے آنے میں گویا خدا کا کلام آگیا۔ چنانچہ یہی توجیہہ مفسرین نے پسند کی ہے۔ جیسا کہ امام رازی کہتے ہیں اِنَّہٗ قَدْ وَرَدَتِ الشَّھَادَۃُ فِیْ کُتُبِ الْاَنْبِیَاءِ الَّذِیْنَ کَانُوْا قَبْلَہٗ فَلَمَّا جَاءَ قِیْلَ ھٰذَا تِلْکَ الْکَلِمَۃُ ـــــ سابقہ نبیوں کی کتابوں میں مسیحؑ کے متعلق جو بشارت تھی، جب وہ آگئے تو کہا وہ کلمہ آگیا۔ (ص۳۱۰)

دوسری توجیہ

یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ کی بشارت ملی تو آپ نے فرمایا بَشَّرْنَاکَ بِالْحَقِّ ہم تمہیں حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں یہ مراد

نہیں کہ الحق کی بشارت دیتے ہیں۔ اب بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اور بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ بالکل ایک جیسی مثالیں ہیں۔ اگر ایک کے ذریعے مسیح "کلمۃ اللہ" بن سکتا ہے، تو دوسری کے ذریعہ اسحاقؑ "الحق" بن سکتا ہے۔ حالانکہ بات صرف اس قدر ہے کہ ایک جگہ تو مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ساتھ بشارت دیتا ہے اور دوسری جگہ مراد ہے کہ ہم تم کو حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں کہ اس کا نام مسیحؑ ہے۔ تو کَلِمَةٌ مِّنْهُ سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کی پیش گوئی ہے اور اسی کی موید یہ بات ہے کہ کَلِمَةٌ مِّنْهُ کے بعد فرمایا اسمہ حالانکہ کلمہ مونث ہے۔ پس اسمہ میں ضمیر مُبَشَّرْ بِهٖ کی طرف جائے گی۔ یعنی اس کا نام جس کی بشارت دی جاتی ہے (ج ا ص ۳۱۰)

جھولے میں باتیں کرنا

"سب بچے عموماً جھولے میں ہی باتیں کرنا سیکھتے ہیں۔ کیونکہ دو سال کی عمر تک جھولے میں رہتے ہیں۔ اگر یہ معجزہ تھا تو کس کا تھا؟ حضرت مسیح تو ابھی نبی نہیں بنے تھے؟ کیا مریم کا؟ تو وہ نبی نہیں۔ جھولے میں جو کلام ان سے منسوب کیا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ جھولے کے بچے کا کلام نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں ہے۔ "اللہ نے مجھے کتاب دی ہے، مجھے نبی بنایا ہے...... نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے......الخ یہ سب کلام ایک بالغ انسان کا ہے جو نہ صرف مکلف ہو چکا ہے، بلکہ جس کو کتاب و نبوت مل چکی ہے۔ کتاب، حکمت، تورات انجیل، لکھنا پڑھنا وغیرہ سب کچھ سیکھ چکے ہیں۔ کیا یہ ایک دن کے بچے کے کام ہیں؟ (ص ۳۱۲)

وفات مسیح

اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ (آل عمران ۳:۵۴) اے عیسیٰؑ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور اپنی طرف تیرا رفع کرنے والا ہوں (ترجمہ، محمد علی)

مُتَوَفِّیْكَ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ۔ اِذَا قَبَضَ رُوْحَهٗ (تاج العروس) قبض نفسہ (لسان العرب) اس کے کوئی معنی سوائے قبض نفس یا روح کے کسی لغت میں نہیں آئے۔ خود قرآن نے بھی صراحت فرمائی ہے۔ اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا (الزمر ۳۹:۴۲)...... توفاہ اللہ میں صرف نفس یا روح کا لینا اہل لغت کا فیصلہ ہے اور اشعار جاہلیت کی، قرآن کریم کی، حدیث کی، علم ادب کی ایک بھی مثال اس کے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی (ص ۳۳۰)

اسی طرح اگر یہ ممکن ہے کہ ایک شخص مع جسد عنصری آسمان پر چلا جائے تو اس پر بروئے لغت عرب تَوَفَّاهُ اللّٰهُ کا محاورہ بولنا جائز نہیں۔ اس کے لئے کوئی اور لفظ چاہئے...... امام المفسرین حضرت ابن عباسؓ سے خود بخاری میں مُتَوَفِّیْكَ کے معنی مُمِیْتُكَ مروی ہیں۔ یعنی تجھے موت دینے والا ہوں (ص ۳۳۱)۔

حضرت مسیحؑ کی وفات کے نام پر بعض لوگ قرآنی تصریحات کے باوجود بہت گھبراتے ہیں اور اس کو نیا عقیدہ خیال کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف اور احادیث میں حضرت عیسیٰؑ کے زندہ آسمان پر ہونے کا ذکر ہے۔ حالانکہ قرآن شریف اور حدیث میں حیات مسیح کا مطلق کوئی ذکر نہیں، بلکہ دونوں جگہ آپ کی وفات کا ذکر ہے اور حیات مسیح جو اجماع امت سمجھا جاتا ہے، اس کا یہ حال ہے کہ چار ائمہ میں سے ایک امام مالک کھلے طور پر وفات مسیح کے قائل ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ عقیدہ "عتبیہ" اور "مجمع البحار" میں صاف الفاظ میں لکھا ہوا موجود ہے۔ قال مالک مات۔ اور باقی تین اماموں میں سے صراحت سے کوئی حیات مسیح کا قائل نہیں۔ پس اصل عقیدہ اہل سنت والجماعت کا وفات مسیح ہے نہ کہ حیات مسیح..... مسلمانوں کے اس مشہور خیال سے کہ حضرت مسیحؑ زندہ آسمان پر ہیں، عیسائی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مسلمانوں کو یہ کہہ کر گمراہ کر رہے ہیں کہ تمام رسول بروئے قرآن کھانے پینے کے محتاج تھے۔ مگر مسیح کا جسم ایسا ہے کہ وہ دو ہزار سال سے خورد ونوش کے بغیر آسمان پر زندہ موجود ہے (ص ۳۳۱، ۳۳۲)

حدیث میں وفات مسیح

کوئی مرفوع حدیث مسیح کے جسد عنصری سمیت زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کی موید موجود نہیں ہے۔ بلکہ وفات کی تائید میں بہت حدیثیں ملتی ہیں مثلاً حدیث معراج میں وفات یافتہ انبیاء کے ساتھ حضورؐ نے حضرت مسیحؑ اور حضرت یحییٰؑ کو ایک ہی جگہ دیکھا اور پھر وہ مشہور حدیث لَوْ كَانَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی حَیَّیْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا اِلَّا اتِّبَاعِیْ اگر موسیٰؑ و عیسیٰؑ زندہ ہوتے تو انہیں میرا اتباع کرنا پڑتا، اور وہ حدیث جس میں ہے اِنَّ عِیْسٰی عَاشَ عِشْرِیْنَ وَمِائَةَ سَنَةٍ عیسیٰ ایک سو بیس برس زندہ رہے اور یہ وہ بات ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، مجھے جبرئیل نے بتائی۔ (ص ۳۳۲)

رفع مسیح

رَافِعُكَ اِلَیَّ (آل عمران:۵۴) اے مسیح اپنی طرف تیرا رفع کرنے والا ہوں (ترجمہ ایضاً)۔ اس سے مراد قرب و درجہ کی بلندی ہے۔ عربی زبان میں کہتے ہیں نِسَاءٌ مَرْفُوْعَاتٌ جس کے معنے لسان العرب نے نساء مکرمات یعنی معزز عورتیں دیئے ہیں۔ قرآن میں ہے خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (واقعہ ۵۶:۳۰) کسی کو بلند کرنے والی ہے۔ یہاں زجاج نے یہ معنی کئے ہیں کہ قیامت گنہگاروں کو ذلیل اور فرماں نبرداروں کا رفع کرے گی یعنی ان کے مراتب بلند کرے گی۔ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ (نور ۲۴:۳۶)۔ یہاں ترفع کے معنی تعظیم ہیں (لسان العرب) یعنی ان گھروں کی تعظیم کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا (اعراف ۷:۱۷۶) اگر ہم چاہتے تو آیات

کے ذریعے اس شخص کو (مرتبہ کی) بلندی بخشتے۔ تفاسیر میں بھی لکھا ہے۔ رفع الی منازل الابرار (بیضاوی) یا اِلٰی مَنَازِلِ الْعُلَمَاءِ یا اِلَی الْجَنَّۃِ (فتح البیان) یعنی نیکوں یا علماء کے مقام کی طرف یا جنت کی طرف۔ اسی آیت (رافعک) کے نیچے ابن جریر لکھتے ہیں۔ وَالرَّفْعُ یَضُمُّ مَعَانِیَ کَثِیْرَۃً مِنْھَا الرَّفْعُ فِی الْمَنْزِلَۃِ عِنْدَہٗ وَمِنْھَا الرَّفْعُ فِی شرفِ الدُّنْیَا وَمَکَارِمِھَا وَمِنْھَا الرَّفْعُ فِی الذِّکْرِ الْجَمِیْلِ وَالثَّنَاءِ الرَّفِیْعِ یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور مرتبہ بلند دنیا میں عزت و مکرمت، اچھی شہرت وغیرہ سب رفع میں داخل ہیں۔ (ص ۳۳۲، ۳۳۳)

حدیث رفع

احادیث رفع کے معنی کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہیں۔ دو سجدوں کے درمیان جو دعا کی جاتی ہے۔ اس میں یہ لفظ آتا ہے وَارْفَعْنِی (اے خدا مجھے رفع دے)۔ کیا آج تک کسی مسلمان کے وہم میں یہ گزرا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جسم سمیت آسمان پر اٹھالے؟

ترمذی میں ہے یُرِیْدُ النَّاسُ اَنْ یَضَعُوْھُمْ وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّا اَنْ یَرْفَعھم لوگ ان کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے رفع کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا ـــ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو مع جسم آسمان پر اٹھالے جانا چاہتا ہے ـــ پھر حدیث میں بار بار آتا ہے فتواضعوا یرفعکم اللہ تواضع کرو اللہ تمہیں بلند کرے گا۔ فَاِذَا تَوَاضَعَ رَفَعَہُ اللّٰہُ بِالسِّلْسِلَۃِ اِلَی السَّمَاءِ السَّابِعَۃِ (کنز العمال جلد ۲ ص ۲۶) جب بندہ تواضع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے زنجیر کے ساتھ ساتویں آسمان پر رفع کرتا ہے۔ یہاں رفع بھی ہے، ساتوں آسمان بھی ہیں اور زنجیر بھی ہے۔ مگر پھر بھی رفع جسم مراد نہیں بلکہ قرب مراد ہے۔

اسی معنی پر ایک قرینہ رافعک الی میں لفظ الی بھی ہے۔ کیونکہ یہ رفع اللہ کی طرف ہے۔ آسمان کی طرف رفع کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ کوئی جسم نہیں جو آسمان پر ہو۔ اللہ کا مکان میں ہونا بالاتفاق ممتنع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی اللہ یا رب کی طرف جانے کا ذکر ہوتا ہے انتقال جسمانی نہیں بلکہ قرب روحانی مراد ہوتا ہے۔ جیسے اِرْجِعِی اِلٰی رَبِّکِ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ۔ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا۔ امام رازی نے "تفسیر کبیر" میں صفائی سے لکھ دیا ہے۔ رَفَعَہٗ فِیْ قَوْلِہٖ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ ھُوَ الرَّفْعَۃُ بِالدَّرَجَۃِ وَالْمَنْقَبَۃِ لَا بِالْمَکَانِ وَالْجِھَۃِ یعنی رَافِعُکَ اِلَیَّ سے مراد درجہ اور مرتبہ میں بلندی ہے نہ کہ مکان اور جہت کی بلندی (ص ۳۳۳)

سورہ نساء میں ذکر مسیحؑ

مَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ (نساء ۴:۱۵۷) نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے صلیب پر مارا، مگر وہ ان کے لئے اس جیسا بنا دیا گیا ہے۔ (ترجمہ، محمد علی)۔ اس کے معنی غلطی سے یوں کئے جاتے ہیں کہ کوئی شخص مسیح کا مشابہ بنا دیا گیا...... الفاظ قرآنی اس (مفہوم) کو ہرگز برداشت نہیں کرتے۔ ضمیر جو شبہ میں ہے وہ صرف حضرت مسیحؑ کی طرف جا سکتی ہے، جن کا ذکر چل رہا ہے اور کسی ایسے شخص کی طرف ہرگز نہیں جا سکتی جس کا ذکر قرآن شریف میں کہیں بھی نہیں بلکہ صحیح حدیث میں بھی نہیں جو مسیح کی جگہ قتل و صلیب کی موت سے مرا ہو...... کسی دوسرے مقتول یا مصلوب کا یہاں اشارہ تک نہیں۔

تاریخ بھی نہایت صفائی سے کہتی ہے کہ مسیح صلیب پر چڑھائے گئے۔ مگر مصلوب نہیں ہوئے بلکہ زندہ اترے۔ البتہ...... وہ مصلوب یا مقتول کے مشابہ ہو گئے، مرقس ۱۵:۲۵ کے مطابق چھ گھنٹے اور یوحنا ۱۹:۱۴ کے مطابق تین گھنٹے سے بھی کم صلیب پر رہے...... مسیح کو دفن نہیں کیا گیا، بلکہ ایک کھلی جگہ میں رکھ کر سامنے ایک پتھر رکھ دیا گیا، جس سے ہوا اندر جاتی رہی (مرقس ۱۵:۴۶) حالانکہ جس کو دفن کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہوا کے آنے جانے کا راستہ نہیں رکھا جاتا...... تیسرے دن جب مریم مگدلینی وغیرہ آئیں تو پتھر کو دروازہ سے ہٹا ہوا پایا (مرقس ۱۶:۴) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کو ہٹا کر مسیح کو اندر سے نکالا گیا...... (یوحنا ۲۰:۱۵) سے ثابت ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی نے حضرت مسیح کو دیکھا تو انہیں باغبان سمجھا، جس سے معلوم ہوا کہ آپ نے بھیس بدلا ہوا تھا۔ کئی دن بعد جب حواریوں نے مسیح کو دیکھا تو ان کے ہاتھوں پر کیلوں کے زخموں کے نشان باقی تھے (یوحنا ۲۰:۲۵ سے ۲۸)۔ لوقا ۲۴:۳۹ تا ۴۴ سے ثابت ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد حواریوں کے ساتھ مل کر آپ نے بھنی ہوئی مچھلی اور شہد کھایا ـــ جلیل تک پیدل سفر کیا (متی ۲۸:۱۰)

مسیح صلیب پر چڑھے مصلوب کی طرح مگر مصلوب نہیں ہوئے یعنی صلیب پر مرے نہیں...... یہ تاریخی واقعات ہیں، جن پر ساری انجیلیں متفق ہیں۔ ان سے عیسائیوں پر اتمام حجت ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ اسناد ان کے نزدیک مسلم ہیں۔

اگر ان کے سامنے ایک نئی کہانی بنا کر رکھ دیں کہ ان کا ہم شکل مصلوب ہو گیا تھا اور وہ آسمان پر چلے گئے۔ تو اس سے کہانی کا مصنف صرف اپنا دل خوش کر سکتا ہے دوسری قوم پر اتمام حجت نہیں کر سکتا۔ یہ روایت نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں، نہ انجیل میں اور نہ کسی تاریخ میں...... اگر کسی کو ہم شکل بنائے بغیر خدا تعالیٰ مسیحؑ کو اٹھا لیتا تو کیا یہودی اس کو آسمان

سے پکڑلاتے، جو خدا نے ایک ہم شکل بنا کر ان کو دھوکے میں ڈال دیا؟ پھر اس روایت کی کئی متضاد شکلیں ہیں:

۱۔ مسیح کے کہنے پر ایک حواری نے ہم شکل ہونا قبول کیا۔ ایک نبی کی شان کے خلاف ہے کہ ایک بے گناہ کو بے ضرورت مروا دے۔

۲۔ وہ ایک منافق تھا۔

۳۔ جو پکڑنے آیا تھا وہ ہم شکل بنا دیا گیا۔

تعجب ہے۔ ان دونوں صورتوں میں کوئی واویلا نہ ہوا اور نہ بتایا گیا کہ میں کون ہوں؟

۴۔ یہود نے جب مسیحؑ کو نہ پایا تو خود ہی ایک یہودی کو پکڑ کر صلیب دے دیا تاکہ لوگوں کو پتہ نہ لگ جائے کہ مسیح آسمان پر چلا گیا۔ اور کسی کو قریب نہ آنے دیا۔

یہ سب اٹکل بچو روایتیں ہیں۔ ایک بات پر اعتراض ہوا تو دوسری بنا لی، دوسری پر ہوا تو تیسری بنا لی...... آج تک کسی جیل خانے کے مفرور کی نسبت یہ خیال کسی شخص نے نہیں کیا کہ وہ آسمان پر چلا گیا ہوگا۔ آسمان پر جاتے ہوئے تو ایک شخص نے بھی نہ دیکھا اور یوں ان کے حوالات سے غائب ہو جانے پر سب لوگ سمجھ لیتے کہ ضرور آسمان پر گئے ہیں یہ کس قدر بعید از قیاس ہے۔

خود قرآن مجید سے ثابت ہے کہ جب یہود نے ان کو مصلوب کرنے کی تدبیریں کیں تو خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ میں تجھ کو طبعی موت ماروں گا۔ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ (جب تو نے مجھے طبعی وفات دی) آسمان پر زندہ لے جانے کا نہ کہیں وعدہ ہے اور ذکر۔ پس نفی قتل و صلب کر کے مقتول و مصلوب کی شبیہ قرار دے کر اور پھر طبعی وفات کا ذکر کر کے معاملہ صاف کر دیا ہے۔

مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (راغب) یعنی اس کے مصلوب ہونے کا علم یقینی کے ساتھ نہیں جانا...... کسی دوسرے کے قتل کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ یہود و نصاری دونوں شک میں رہے بقول لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ کسی کو بھی قتل کا یقین نہیں ہوا۔ تین گھنٹے کے اندر اندر صلیب سے اتر آنا، ٹانگیں نہ توڑا جانا، پیلاطوس کا شک کرنا، پتھر کا ہٹا ہوا پایا جانا۔ حواریوں سے خفیہ ملاقاتیں۔ کیا یہ صریح امور نہیں۔ جن کا لازمی نتیجہ شک ہونا چاہئے۔ جو دونوں گروہوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ اگر وہ آسمان پر چلے گئے تھے اور ان کا ہم شکل مصلوب ہوا تھا تو شک کیسا اور علم کا نہ ہونا کیا معنی مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ان کو کوئی علم نہیں۔ صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں۔ (النساء:۷ ۱۴) تفصیل کے لئے دیکھئے (ص۵۷۵ تا ص۵۷۹)

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيْسٰى ...... الخ (مائدہ ۵:۱۱۶ تا ۱۱۹) جب اللہ نے عیسیٰؑ سے کہا۔ "اے عیسیٰؑ ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنالو"؟ کہا "تو پاک ہے مجھے کہاں شایان تھا کہ میں وہ کہوں جس کا مجھے حق نہیں؟ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے ضرور اس کا علم ہوتا۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تُو مخفی رکھتا ہے کیونکہ تو غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب اور تمہارا رب ہے اور میں ان پر گواہ تھا۔ جب تک میں ان میں تھا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تُو ہی ان پر نگہبان تھا...... الخ (ترجمہ، محمد علی)

یہ کلام عالم برزخ کا ہے، جو نزول قرآن سے پہلے ہو چکا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں اسی کی تفسیر میں حدیث ہے کہ قیامت کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے بعض لوگوں کو دوزخ کی طرف جاتے دیکھیں گے۔ آگے لفظ ہیں فَاَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ میں کہوں گا جیسے عبد صالح یعنی عیسیٰؑ نے کہا —— یہاں اپنے لئے صیغہ مضارع (اقول) اور عیسی کے لئے صیغہ ماضی (قال) استعمال کیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے۔

یہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ حضرت مسیحؑ کی وفات کو قطعی طور پر ثابت کرتی ہے، کیونکہ عیسائیوں کا عقیدہ بگڑنے کا زمانہ حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد قرار دیا ہے اور چونکہ وہ عقیدہ نزول قرآن سے پہلے بگڑا ہوا تھا اس لئے حضرت عیسیٰؑ کی وفات بھی نزول قرآن سے پہلے ہو چکی تھی...... بخاری کی یہ حدیث اس آیت کی فیصلہ کن تفسیر کرتی ہے۔ "جب قیامت کے دن میری امت کے بعض لوگ پکڑ کر دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تُو نہیں جانتا کہ تیرے بعد انہوں نے کیا کیا۔ فَاَقُوْلُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ یعنی میں وہی بات کہوں گا جو عیسیٰؑ نے کہی تھی اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو تُو ہی ان پر نگہبان تھا"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انہی الفاظ کو استعمال کرنا صاف بتاتا ہے کہ آپؐ کے نزدیک عیسیٰؑ کی امت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد بگڑی۔ اس قطعیت الدلالت آیت اور اس حدیث صریح کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ کی وفات کا انکار کرنا نصوص صریحہ کو رد کرنا ہے اور توفیتنی کے معنی سوائے وفات کے کچھ اور کرنا لغت کے خلاف ہے ......الخ (ص۶۵۹، ۶۶۰)

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (جماعت احمدیہ لاہور) کے عقائد

۱ ہم اسلام کے پانچوں ارکان توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور تمام ان عقائد و احکام پر ایمان رکھتے ہیں جو قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں درج ہیں، اور جن پر سلف صالحین اور اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے۔

۲ ہمارا ایمان ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔

۳ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جبرائیل کسی شخص پر بھی وحی نبوت لے کر نازل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹ جاتی ہے۔

۴ وحی نبوت کے منقطع اور مسدود ہونے کے بعد صرف ولایت کا سلسلہ جاری ہے، تاکہ امت محمدیہ کے ایمان و اخلاق کی آبیاری ہوتی رہے۔

۵ اس امت میں حضور نبی کریم صلعم کے ارشاد کے مطابق صرف اولیاء کرام، مجددین اور محدثین آسکتے ہیں، نبی نہیں آسکتے۔

۶ اس امت کے مجددین میں سے حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی چودھویں صدی کے مجدد ہیں جیسا کہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں مجددین آتے رہے ہیں، لیکن حضرت مرزا صاحب کے دعویٰ کے انکار سے کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا۔

۷ ہمارے نزدیک ہر کلمہ گو مسلمان ہے اور ہم مسلمانوں کے کسی فرقہ کو بھی دائرۂ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے۔ ہم آئمہ اربعہ کے علاوہ اہل سنت والجماعت اور اہل تشیع کے آئمہ اور بزرگوں کا دل سے احترام کرتے ہیں، اور ان کی خدمات اسلامی کے معترف ہیں۔

۸ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور، ایک تبلیغی ادارہ ہے، جو یورپ و امریکہ، افریقہ اور کئی دیگر ممالک میں اشاعت اسلام کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ، قرآن مجید کے دنیا کی مختلف زبانوں میں تراجم اور ان کی اشاعت کے سوا ہمارا اور کوئی مقصد نہیں، اور اسی کام پر ہمیں مجدد زمان نے لگایا تھا اور یہی آپ کی بعثت کی غرض تھی جیسا کہ آپ نے فرمایا: "یاد رکھنا چاہئے کہ ہمیں بجز خادم اسلام ہونے کے اور کوئی دعویٰ نہیں"۔

صدر الدین

امیر جماعت احمدیہ، لاہور